سیرۃ النبیؐ کے تناظر میں

ریاستِ مدینہ کا قیام و نظام

تالیف:

مولانا مفتی محمد ایاز

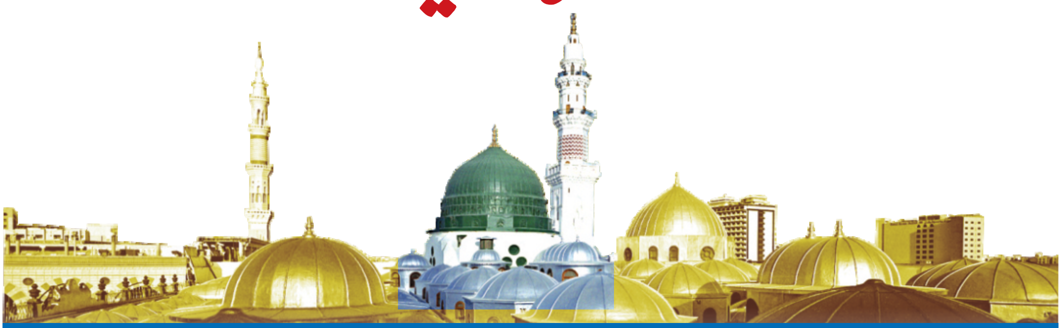

اشاعت اکیڈمی
091-2580325 / 2590315

ریاست مدینہ

کا

قیام و نظام

ابو معاویہ مولانا مفتی محمد ایاز حفظہ اللہ

العلم پبلیکیشنز محلہ جنگی پشاور
091-2590315

فہرست مضامین

تعارف سیرت	7
کتب سیرت کے مختلف مناہج	9
"سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ہی جامع و مستند سیرت	14
ریاست مدینہ کے قیام کا پس منظر	20
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت حکمران	20
مکہ کی شہری ریاست	24
بیعت عقبہ اور مدینہ کی ریاست کی بنیاد	27
ریاست مدینہ کے قیام کا طریقہ کار	32
مدینہ منورہ کا محل وقوع	32
قیام ریاست کے لیے ابتدائی تین کام	37
مسجد نبوی اور اس کا نظام	39
مسجد نبوی کا نظام اور معاشرے میں کردار	44
مسجد کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق	48
دور نبوی کا نظام مواخات	51
مکہ میں مواخات کا قیام	51
مدینہ میں قیام مواخات اور اس کی وجوہات	52
مواخات اور انصار کا ایثار	53
ریاست مدینہ کا دستور (میثاق مدینہ)	58
میثاق و دستور مدینہ کے دفعات	60
ریاست مدینہ کا نظم و نسق	69

نقبا کی تقرری	70
مردم شماری	71
امن و امان	71
ٹاؤن پلاننگ	72
تعمیرات	73
سیکٹریٹ	74
وزارت	75
ریاستِ مدینہ کا تعلیمی نظام	76
تعلیم بذریعہ خط و کتابت	77
درس گاہیں اور تعلیم کی نگرانی	78
نصاب تعلیم	81
وثیقہ نویسی اور زبان دانی	85
ریاست مدینہ کا شعبہ امور خارجہ	87
شعبہ امور خارجہ کا قیام اور مقاصد	87
شعبہ تالیف قلب	88
شعبہ سفراء	89
شعبہ مہمان داری	90
ریاست مدینہ کا شعبہ عدلیہ و قضاء	93
شعبہ احتساب یا دیوان مظالم	97
ریاست مدینہ کا دفاعی نظام	98
دفاع کے لیے جدید اسلحہ کا حصول	99
شعبہ سراغ رسانی یا انٹیلی جنس	100

دیوان	101
رضاکارانہ فورس	101
فوجی ٹریننگ اور تیاری	102
پرامن فتوحات اور فوجی کاروائیاں	102
ریاست مدینہ کا معاشی نظام	104
اسلام کا معاملات کے بارے میں اصول	105
مدینہ کے ذرائع معاش	106
مدینہ میں اسلامی معیشت کا قیام	108
ریاست مدینہ میں اقلیت	116

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف سیرت

سیرت کا لغوی معنی طریقہ کار، چلنے کی رفتار اور انداز کے ہیں۔ اس لحاظ سے عربی زبان میں سیرت کے معنی کسی کا طرز زندگی (Life style) یا زندگی گزارنے کا اسلوب ہے۔ آج دنیا میں تمام مسلم زبانوں اور بہت غیر مسلم زبانوں میں بھی سیرت کا لفظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زندگی مبارک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

شاہ عبد العزیز دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "عجالہ نافعہ" میں سیرت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"آنچہ بہ وجود پیغمبر و صحابہ کرام وآل عظام است و از ابتدائے تولد آں جناب تا غایت وفات، آں راسیرت گویند"۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود گرامی سے جو کچھ بھی متعلق ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام، اہل بیت اور آل عظام سے جو بھی چیز تعلق رکھتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ سے لے کر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے تک، ان سب کی تفصیل کو اسلامی علوم وفنون کی اصطلاح میں سیرت کہتے ہیں۔

تمام بانیانِ مذاہب اور مؤسسین ادیان، جو اس وقت دنیا میں رائج ہیں، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ ہی واحد تاریخی شخصیت ہے، جو پوری طرح اور ہر پہلو سے تاریخ کی سرچ لائٹ میں دنیائے انسانیت کے سامنے ہیں، جس کا ہر ہر گوشہ نصف النہار کے آفتاب کی طرح روشن ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑے سے بڑا مخالف بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت اور حقیقی شخصیت کے بارے میں ذرہ برابر شک کا اظہار نہیں کر سکتا۔ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے آنے والے بہت سے بانیانِ مذاہب کے وجود کے بارے میں خود ان کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں کے حلقوں میں بہت سے شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔تورات، انجیل اور زبور وغیرہ کے نام سے آج جو مجموعے ہمارے سامنے ہیں۔ وہ ان مقدس شخصیات کی حیات طیبہ، سوانح اور خدمات کے بارے میں یا تو تقریباً خاموش ہیں یا بہت ہی سرسری اور متضاد معلومات پر مشتمل ہیں۔ وہ معلومات جو ان کتابوں سے ان عظیم الشان انبیاء اور معلّمین انسانیت کے بارے میں ملتی ہے، وہ انتہائی اجمالی اور سطحی ہے۔ تاہم اس کے مقابلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حیات طیبہ پر آج تک مسلسل نہ صرف غور وخوض کیا جارہا ہے اور لکھا جارہا ہے، بلکہ تصنیف وتالیف کے حوالے سے وہ عنوان ہے جس پر آج تک سب سے زیادہ لکھا جا چکا ہے۔ سیرت کے نام پر آج پورے کتب خانے قائم ہیں ۔ سیرت کے نام پر ادارے اور مسندیں قائم ہیں جہاں سیرت کے مختلف موضوعات پر تحقیق اور مطالعہ کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔

سیرت ایک مستقل فن اور علم بن چکا ہے۔ یقینا سیرت ایک لامتناہی اور متلاطم سمندر ہے۔پھر سیرت کا علم محض ایک شخصیت کی سوانح عمری نہیں، بلکہ یہ ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک قوم، ایک ملت، اور ایک الٰہی پیغام کے آغاز اور ارتقاء کی ایک انتہائی اہم اور مفید داستان ہے۔

ایک مغربی مستشرق ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے کہ: "آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کا سلسلہ لامتناہی ہے، لیکن اس میں جگہ پانا قابل عزت اور باعث شرف ہے، اللہ تعالیٰ یہ عزت اور شرف ہمیں بھی بخش دیں۔

بہر حال سیرت ایک لامتناہی، کامل، جامع اور مختلف النوع موضوعات پر مشتمل علم ہے، جس کی مزید شاخیں اقسام ہیں جس پر علماء اسلام اور سکالروں نے الگ الگ شاخ اور سیرت کے الگ الگ قسم پر مختلف کتابیں لکھی ہیں۔اس کے ان اقسام اور شاخوں میں سے چند اہم یہ ہیں۔

کتب سیرت کے مختلف مناہج

تاریخی، واقعاتی، یا لوک سیرت:

اس سے مراد سیرت کی وہ قسم اور شاخ ہے، جس میں عوامی انداز میں واقعاتی طور پر ابتداء سے آخر تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بیان کرنا ہے، جس پر اہل علم قدیم زمانے سے چھوٹی بڑی کتابیں لکھتے چلے آرہے ہیں۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو سیرت کے بنیادی حقائق سے آگاہ کرنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت، فضیلت اور بزرگی لوگوں کے سامنے آشکارہ کرنا اور اس کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا ایمانی اور محبت کا رشتہ استوار کرنا ہے۔

تعلیمات سیرت:

اس سیرت کا تعلق وہ معلومات یا وہ شعبے ہیں جو علم کی نشر و اشاعت تعلیم و تعلم سے متعلق ہے۔ اس سیرت میں یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم کائنات اور معلم انسانیت کی حیثیت سے اس فریضے کو کس طرح انجام دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت تعلیم، اسلوب تعلیم اور طرز تعلیم کیا تھا وغیرہ۔

روحانیت سیرت:

اس سے مراد بنیادی طور پر تزکیہ اور اصلاح نفوس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایات ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تزکیۂ نفس، روحانی پاکیزگی اور تربیت کے لیے کیا اقدامات اختیار کیے۔

ادبیات سیرت:

اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات اور مکاتیب کا ادبی اعتبار سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا عربی زبان کے اسالیب، ساخت، طریق ادا اور طرز بیان پر کیا اثر پڑتا ہے اور عربی زبان کو کون کون سے نئے اسالیب عطا فرمائے، عربی کو کیا رونق بخشی۔

نفسیات سیرت:

اس سیرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی پشت پر کارفرما حکمتوں کو اجاگر کیا جاتا ہے کہ مخاطب کی ذہنی سطح، نفسیات، خیالات اور تصورات کو مد نظر رکھتے ہوئے کیسے ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

جغرافیات سیرت:

اس سے مقصود یہ بات ہے کہ جس جغرافیائی ماحول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے ،اور جہاں یہ سارا کام ہو رہا تھا اُس علاقے کی جغرافیائی حیثیت کیا تھی۔ اُس وقت کون کون سے شہر آباد تھے اور وہ کہاں کہاں کتنے فاصلے پر واقع تھے۔

کلامیات سیرت:

سیرت کی اس قسم سے مراد وہ موضوعات ہیں جو علم کلام اور عقائد سے متعلق ہیں، جو اصلاً سیرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے نبوت و رسالت کی حقیقت و ضرورت ،وحی کی حقیقت و ضرورت، ختم نبوت، معجزات، معراج وغیرہ عنوانات پر کلامی بحث کرنا۔

فقہیات سیرت:

اس سے مراد سیرت کی روشنی میں احکام شریعت کو جاننا ہے بظاہر اگرچہ فقہ اور سیرت دو الگ الگ چیزیں سمجھی جاتی ہیں، کیونکہ فقہ کا دائرہ کار قانون اور شریعت کے اصول ہیں اور سیرت کا دائرہ کار عموماً تاریخ اور رسول اللہ کی سوانح عمری ہے، لیکن حقیقت میں ان دونوں میں بڑا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ فقہ سے چونکہ مراد عمیق فہم ہے۔اس لیے جب تک قرآن کریم،سنت مبارکہ اور سیرت طیبہ کا ذوق اور گہری سمجھ بوجھ نہ ہو تو اس وقت تک شریعت کے قوانین اور احکام پر عمل کرنا آسان نہیں ہے۔اس لیے فقہ اور سیرت میں انتہائی اور قریبی ربط پایا جاتا ہے۔

شریعت کے بہت سے احکام کی تفسیر، سیرت کے بغیر نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس اعتبار

سے سیرت ہی کی عملی تطبیق کا نام فقہ ہے۔آج بیسویں صدی کی ابتدا سے فقہ السیرۃ کے نام سے مطالعہ سیرت کا ایک نیا انداز متعارف ہو گیا ہے۔

اس فقہ السیرۃ سے مقصد محض سیرت کے واقعات بیان کرنا، محض سیرت کی تاریخی تفصیلات سے اعتنا کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ سیرت کے ان تاریخی واقعات اور تفصیلات میں جو سبق پنہاں ہے ،اس کو نمایاں کیا جائے، جو بصیرتیں اور حکمتیں سیرت پاک کے واقعات میں پوشیدہ ہیں، ان کو سامنے لایا جائے اس طرح کے کاوش کا نام فقہ السیرۃ یا فقہیات سیرت ہے۔

اجتماعیات یا سیاسیات سیرت:

اس سے مراد یہ ہے کہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ اجتماعیت کے نقطہ نظر سے کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقدامات اور فیصلوں کا اجتماعی پس منظر کیا تھا، مدینہ منورہ میں اجتماعیت کس طرح کی تھی ، کون کون سے خاندان اور قبائل آباد تھے۔ اس میں تعلقات کی نوعیت کیا تھی مدینہ کی زندگی اور معاشرت کیا تھی، مکہ کی شہری ریاست کیا تھی اور پھر مدینہ میں ریاست کیسے اور کن کن اقدامات سے وجود میں آئی۔ پھر اس ریاست میں حکومت کس نوعیت کی تھی، کس قسم کا نظام اور کون سے شعبہ جات قائم تھے وغیرہ تو اس اجتماعی اور سیاسی پہلو پر سیرت نبوی کے مطالعہ کو اجتماعیات سیرت یا سیاسیات سیرت کہتے ہیں۔

بندہ کا یہ زیر نظر رسالہ بھی سیرت کے اس موخر الذکر قسم سے متعلق ہے۔سیرت پر کچھ لکھنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر لکھنے والے سعادت مند لوگوں کی صف میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہو جائے۔

بقول مشہور مستشرق الیس سپرنگر:

”ہر مسلمان صاحب علم و قلم کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

سیرت نگاری کی طویل فہرست میں اپنا نام شامل کرے گا اگرچہ آخر میں کیوں نہ ہو"۔

اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ عام طور پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں جو غلط فہمی ہے یا غلط پراپیگنڈا کیا جارہا ہے کہ اسلام صرف مسجد اور چند عبادات، ریاضات اور چند ذکر اذکار تک محدود دین ہے۔ اور پیغمبر اسلام صرف انہی عبادات اور مسجد و خانقاہ تک محدود دین لے کہ آئے تھے۔ سیکولر مائینڈ لوگوں کے خیال کے مطابق اسلام کا سیاست مملکت اور نظام مملکت، تہذیب و تمدن، معیشت اور تعلیم سے کیا تعلق ہے، جبکہ حقیقت ان کے خیال اور غلط فہمی کے برعکس ہے کہ اسلام ایک عالمگیر، جامع اور زندگی کے تمام شعبہ جات میں رہنمائی کرنے والا کامل دین اور دستور حیات ہے۔ جس کی دعوت اور اقامت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ بعثت کے بعد آپ نے اس کامل دین اسلام کو لوگوں کے سامنے بھرپور طریقے سے پیش کیا، بلکہ اسے نافذ کرکے اپنا فرض منصبی پورا کرگئے۔ تاہم اس مقصد کے پیش نظر کہ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع شخصیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل مقصدیت سے واقف ہو کر مسلمانوں کی غلط فہمی، دین کا غلط تصور ختم ہو کر حقیقت حال سے باخبر ہو جائے، اس پہلو پر اپنی گزارشات کو قرطاس کے سپرد کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ دین کی حقیقت اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے باخبر ہو کر اس پر عمل پھیرا ہونا ہی سعادت اور نجات کا ذریعہ ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ:

"سیرت کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض ہے۔ اس لیے کہ سعادت دارین رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی رہنمائی اور ہدایت پر مبنی ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو اپنے لیے سعادت کا طالب ہے، اپنا خیر خواہ ہے اور اپنی نجات چاہتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت، آپ کی سیرت اور آپ کے معاملات سے آگاہی حاصل کرنے کا پابند اور مکلّف ہے"۔

بہر حال زیر نظر رسالہ دراصل صبح اخبار کے ہفتہ وار دینی ایڈیشن میں ریاست مدینہ پر میرے چند شائع شدہ کالموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ اس رسالے اور مضامین کی تیاری میں بندہ نے سیرت ابن ہشام، الوفاء الوفاء للسمعودی رحمہ اللہ، محاضرات سیرت ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی کتابوں، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے میدان جنگ، خطبات بہاولپور، اکرام ضیاء العمری کی کتاب عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مدنی معاشرہ جو عذرا نسیم فاروقی کا اردو ترجمہ، اور سیرت خیر الانام، دائرہ معارف اسلامیہ جامعہ پنجاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں دین کا حقیقی علم و فہم اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ اور صحیح سمجھ کے ساتھ اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اٰمِین یَا رَبَّ الْعَالَمِین۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَبَارِكْ وَسَلِّم

ابو معاویہ محمد ایاز درانی پشاوری
جامعہ تبلیغ القرآن یوسف آباد پشاور شہر
مارچ ۲۰۱۳ء بمطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ

”سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ ہی جامع و مستند سیرت

ویسے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے موضوع پر مختلف اوقات وایام میں سال بھر کانفرنسیں، سیمینارز اور جلسے منعقد ہوتے ہیں، لیکن ماہ ربیع الاول کی آمد سے ان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایک مسلمان کے لیے سال کے ۱۲ مہینے، مہینہ کے ۳۰ دن، دن کے ۲۴ گھنٹے، گھنٹے کے ۶۰ منٹ اور ہر لحظہ ربیع الاول ہی ربیع الاول ہے۔ اس میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور دنیا میں تشریف آوری پر خوشی کا اظہار اور اس نعمت کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، لیکن اس اظہارِ تشکر کے ساتھ ساتھ اہم بات پیامِ میلاد کو ہر وقت اور ہر لحظہ یاد رکھنا فرض ہے اور ایک منٹ کے لیے بھی پیامِ میلاد کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ یہی کامیابی کا راز ہے۔

الغرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ایک مسلمان کی عقیدت و محبت اس کے ایمان کا حصہ اور اس کی فطرت کا لازمی ہے۔ ایک مسلمان اور مومن کے لیے خود کو جاننا اتنا ضروری نہیں، جتنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں جانتا وہ اپنے ایمان اور اسلام کو کیسے جان سکتا ہے۔ مومن اپنے وجود ایمانی میں سراسر وجود پیغمبر کا محتاج ہے۔ عیاذاً باللہ اگر وجود پیغمبر سے قطع نظر کر لی جائے، تو ایک لمحہ کے لیے بھی مومن کا وجود ایمانی باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی وجہ سے ارشاد ہے:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ [احزاب]

”نبی، مومنین کے حق میں ان کی جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔“

بقول محدث اعظم مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ:

”مومن کا وجود ایمانی آفتاب نبوت کا ایک معمولی سا عکس اور پرتو ہے اور ظاہر ہے کہ

پرتو کو جو قرب اور تعلق اپنے اصل منبع یعنی آفتاب سے ہو سکتا ہے وہ آئینہ سے نہیں ہو سکتا۔ مومن کے ایمان کو جو تقویت پہنچتی ہے وہ نبی کے واسطے سے ہی پہنچتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان نبی سے قریب ہے اور مومن سے بعید ہے اس لیے کہ نبی، ایمان کے ساتھ متصف بالذات ہے اور مومن ایمان کیساتھ متصف بالعرض ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مومن اپنے ایمان کے جاننے سے پہلے اپنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جانے تاکہ اسی راستے پر چلے اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی دعوت دے۔" [سیرت المصطفیٰ]

جس سورت میں کسی نبی کی سیرت بیان ہوئی ہے، اُس سورت کو انہیں انبیاء کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جیسے: سورۃ یونس اور سورہ ہود اور سورہ یوسف اور سورہ ابراہیم وغیرہ اور سورہ لقمان اور سورہ کہف حضرت لقمان اور اصحاب کہف کے نام سے موسوم ہوئیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امتوں نے اپنے انبیاء کی سیرت اور تاریخ لکھنے کا اہتمام کیا ہے مگر وہ سب ناتمام ہیں۔ جن قوموں کا یہ حال ہو کہ اُن کے پاس اپنا صحیفہ اور آسمانی کتاب تک محفوظ نہ ہو اور یہ تک معلوم نہ ہو کہ کس پر اترا، کب اترا، کہاں اترا اور کس طرح اترا اور جس کو اپنے اپنے مقتدا اور پیشوا سمجھتے ہوں اس کی قبر تک کا نشان بھی ان کو معلوم نہ ہو وہ اپنے اس مقتدا کی مکمل سیرت اور سوانح حیات کہاں پیش کر سکتے ہیں۔ پوری زندگی کے حالات اور واقعات تو بڑی چیز ہے وہ اپنے پیشوا کا ایک کلمہ بھی ایسا نہیں پیش کر سکتے جس کی سند ان کے پیشوا تک متصل اور مسلسل ہو۔

بحمد اللہ یہ شرف صرف امت محمدیہ (علی صاحب الف صلوٰۃ والف الف تحیۃ) کو حاصل ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے ہر قول و فعل کو متصل اور مسلسل سند کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ عہد نبوت سے لے کر اس وقت تک کوئی لمحہ اور کوئی لحظہ ایسا گزرا کہ جس میں یہ امت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقطع ہوئی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء اور تمام مذہبی رہنماؤں میں اس لحاظ سے یکتا ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بھی

محفوظ ہے جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ بچپن سے لے کر آخری سانس تک، جتنے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ کے حالات زندگی کا مشاہدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سنے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سنیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی چیز کا حکم دیتے ہوئے سنا، کسی چیز سے منع کرتے دیکھا، ان کی ایک عظیم تعداد تقریباً ایک لاکھ تک پہنچتی ہے، جنہوں نے آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے ہوئے واقعات بعد کی نسل تک منتقل کیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احکام خود لکھوا کر بھی بعض لوگوں کو دیے یا بھیجے تھے جو بعد کے لوگوں کو ملے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کم از کم چھ اصحاب ایسے تھے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا دی تھیں، تاکہ ان میں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ یہ تحریریں بھی بعد کے آنے والوں کو ملیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کم از کم پچاس صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، واقعات اور اقوال تحریری صورت میں جمع کیے اور یہ ذخیرۂ علم بھی ان لوگوں تک پہنچا جنہوں نے بعد میں احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کی خدمت انجام دی۔

پھر جن صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے سیرت کی معلومات زبانی روایت کیں ان کی تعداد، بعض محققین کے نزدیک ایک لاکھ تک پہنچتی ہے اور حجۃ الوداع کے موقع پر تو ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین موجود تھے۔ اتنے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کا طریقہ سیکھا۔ وہ تقریر سنیں جو اس حج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھیں۔ کیسے ممکن ہے کہ اتنے لوگ جب ایسے اہم موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک ہونے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں واپس پہنچے ہوں گے تو وہاں ان کے عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں نے ان سے اس سفر کے حالات اور حج کے احکام دریافت نہ کیے ہوں۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم شخصیت کے اس دنیا میں گزر جانے کے بعد لوگ کس اشتیاق کے ساتھ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال واقوال اور احکام وہدایات ان لوگوں سے پوچھتے ہوں گے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنے تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے جو روایات بعد کی نسلوں کو پہنچی تھیں، ان کے بارے میں ابتدا ہی سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے کوئی بات کہتا، اس کو یہ بتانا پڑتی تھی کہ اس نے وہ بات کس سے سنی ہے اور اوپر سلسلہ بہ سلسلہ کون کس سے وہ بات سنتا اور آگے بیان کرتا رہا ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت کی پوری کڑیاں دیکھی جاتی تھیں تاکہ یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صحیح طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہے۔ اگر روایت کی پوری کڑیاں نہ ملتی تھیں تو اس کی صحت مشتبہ ہو جاتی تھی۔ اگر کڑیاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتیں، لیکن بیچ میں کوئی راوی ناقابل اعتماد ہوتا تو ایسی روایت بھی قبول نہ کی جاتی تھی۔

آپ ذرا غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ دنیا کے کسی دوسرے انسان کے حالات اس طرح سے مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی بات بھی سند کے بغیر تسلیم نہیں کی گئی اور سند بھی صرف یہ نہیں دیکھا گیا کہ ایک حدیث کا سلسلہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے یا نہیں، بلکہ یہ بھی دیکھا گیا کہ اس سلسلے کے تمام راوی بھروسے کے قابل ہیں یا نہیں۔

کیا انسانی تاریخ میں کوئی دوسرا شخص ایسا پایا جاتا ہے جس کے حالات زندگی اس قدر مستند طریقے سے منقول ہوئے ہیں؟ اور کیا اس کی کوئی مثال ملتی ہے کہ ایک شخص کے حالات کی تحقیق کے لیے ان ہزارہا آدمیوں کے حالات پر کتابیں لکھی گئی ہوں، جنہوں نے اس ایک شخصیت کے متعلق کوئی روایت بیان کی ہو؟ موجودہ دور کے عیسائی اور یہودی علماء احادیث کی صحت کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا جو زور صرف کر رہے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ حسد ہے کہ ان کے دین کی کتابوں اور ان کے پیشوایان دین کے حالات کے سرے سے کوئی

سند ہی نہیں ہے۔ اسی جلن کے باعث انہوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کے معاملہ میں علمی دیانت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف یہی ایک خصوصیت نہیں ہے کہ وہ ہمیں نہایت مستند ذرائع سے پہنچی ہے، بلکہ اس کی یہ بھی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر پہلو کی اتنی تفصیلات ملتی ہیں جو تاریخ کے کسی دوسرے شخص کی زندگی کے بارے میں نہیں ملتیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان کیسا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیسے نازل ہوتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت کس طریقے سے پھیلائی، مخالفتوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کس طرح کیا، اپنے ساتھیوں کی تربیت کیسے کی، اپنے گھر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح رہتے تھے، اپنی بیویوں اور بچوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ کیسا تھا، اپنے دوستوں اور دشمنوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ کیسا تھا، کس اخلاق کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اخلاق کیا تھا، کس چیز کا حکم دیا، کس کام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا، کس کام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوتے دیکھا اور منع نہ کیا اور کس چیز کو ہوتے دیکھا اور منع فرمایا۔ یہ سب کچھ ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فوجی جنرل بھی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے تمام حالات ہمیں ملتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جج بھی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہونے والے مقدمات کی پوری پوری رودادیں ہمیں ملتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس مقدمے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فیصلہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بازاروں میں بھی نکلتے تھے اور دیکھتے تھے کہ لوگ خرید و فروخت کے معاملات کس طرح کرتے ہیں۔ جس کام کو غلط ہوتے ہوئے دیکھتے، اس سے منع فرماتے تھے اور جو کام صحیح ہوتے دیکھتے اس کی توثیق فرماتے تھے۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے

متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیلی ہدایات نہ دی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بے جا تعصب کے بغیر، پورے علم ویقین کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہ السلام اور پیشوایان مذاہب میں سے صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ ہستی ہیں، جن کی طرف نوع انسانی، ہدایت ورہنمائی کے لیے رجوع کر سکتی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی کتاب اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ان تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ جو ہدایت کے لیے درکار ہیں، نہایت مستند و معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جامع اور کامل بھی ہے جس طرح کلام اللہ بحر بے کناں ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بھی کوئی کنارہ نہیں۔

مشہور مستشرق الیس سپرنگر **(Alias Springer)** جنہوں نے "مغازی" کی تدوین کرکے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا اعجاز یہ ہے کہ اس پر چودہ سو سال سے لوگ لکھ رہے لیکن پھر بھی اس کا اختتام نظر نہیں آرہا اور اس کے علاوہ ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ اُس کی کوئی نسبت پیدا ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان صاحب علم و قلم کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نگاری کی طویل فہرست میں اپنا نام شامل کرے اگرچہ آخر میں کیوں نہ ہو۔"

جب تک یہ دنیا قائم ہے، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صاحبان علم ودانش اپنے اقلام معطر کرتے رہیں گے، لیکن سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احاطہ کسی صورت ممکن نہیں۔

ریاست مدینہ کے قیام کا پس منظر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت حکمران:

یہ حقیقت ہے کہ نبی دنیا کا طالب نہیں ہوتا، لیکن پھر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں ایک ریاست، حکومت اور اقتدار کیسے قائم کرنا پڑا۔ دنیاوی اقتدار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے اور اس کے باوجود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکومت قائم کرتے ہیں اور ایک حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے حکمرانی بھی فرماتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تاثر پیدا ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان اور منفرد کارنامے کو محض ایک ریاست کا قیام، محض دنیاوی معاملات کی تکمیل، محض انتظامی نظم و نسق کی بہتری اور فراہمی سمجھ لیا جائے۔

جیسا کہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک معاہدہ کے نتیجہ میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے جہاں آپ نے ایک ریاست قائم فرمائی۔ شریعت کے تفصیلی احکام نافذ فرمائے۔ معاشرتی، تمدنی، عائلی اور دیگر اصلاحات نافذ فرمائیں۔ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر مغربی مستشرقین میں سے بہت سوں کو یہ سمجھنے میں ناکامی ہوئی ہے کہ ایک پیغمبر حکمرانی کیسے کر سکتا ہے خاص طور پر عیسائی حضرات پیغمبری کے جس تصور سے مانوس ہیں، وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا زہد و استغناء ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دنیا سے بیزاری اور ترک دنیا کا رجحان ہے۔ ان کے تصور میں رہبانیت اور دنیا کے تمام معاملات سے لاتعلق رہنا ہی نبوت کی شان ہے۔ اس لیے ان میں سے بہت سوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک نبی اور پیغمبر ریاست کیسے قائم کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے معتدل سے معتدل ترین لوگوں نے بھی اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا۔

منٹگمری واٹ ایک انگریز مستشرق ہے جو انتہائی معتدل اور منصف مزاج پایا گیا ہے۔ انہوں نے (Muhammad at Madina) اور (Muhammad at Mecca) کے نام

سے دو بہت مشہور کتابیں لکھی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے بین السطور میں ہر جگہ یہ بات نمایاں ہے کہ مکہ میں تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز ایک نبی کا تھا، لیکن مدینہ میں آپ کے مزاج، انداز اور پیغام میں تبدیلی آئی اور وہاں جا کر آپ ایک بادشاہ اور حکمران بن گئے۔

یہ اعتراض یا شبہ ایک تو اسلام کے مزاج اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی خاتمیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محض تارک الدنیا لوگوں کی فوج بنانے نہیں آئے تھے۔ آپ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً کی جامعیت پیدا کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ:

أَنَا نَبِيُّ الْمَلْحَمَةِ أَنَا نَبِيُّ الْمَرْحَمَةِ

"میں جہاں رحمت کا نبی ہوں وہاں میں جنگ کا نبی بھی ہوں۔"

ایک اور موقع پر فرمایا: أَنَا الضَّحُوكُ الْقَتَّالُ

یعنی میں جہاں انسانوں کے لیے مسکراہٹیں بکھیرنے کے لیے آیا ہو وہاں بدکرداروں اور ظالموں کے لیے شمشیر براں بھی ہوں اور مجھے ان کے ساتھ جنگ کرنے کا مکلّف بنایا گیا ہے۔

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں پہلے دن ہی سے دونوں چیزیں جمع تھیں۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر آخر الزمان، خاتم الرسل، دانائے سبل ہیں۔ آپ کا اصل مقصد اور ہدف جس کی خاطر آپ کو دنیا میں بھیجا گیا وہ قرآن مجید میں فرائض چہارگانہ کی صورت میں بیان کر دیا گیا۔ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ، یعنی قرآن مجید کی آیات تلاوت کر کے لوگوں تک پہنچانا ، وَيُزَكِّيهِمْ، لوگوں کی اعتقادی، اخلاقی، روحانی اور اندرونی اصلاح کرنا یعنی تزکیہ نفس، وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، کتاب اللہ کے اسرار و رموز کی تعلیم دینا اور اس کی بنیاد پر وحی کی روشنی میں جو دانائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی،

جس کے سرچشمے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے جاری ہوئے، ان کی تعلیم انسانیت کو دینا۔ یہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی ذمہ داری۔ اسی کو انجام دینے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کو نہیں آنا تھا، کسی اور شریعت کو نازل نہیں ہونا تھا، کسی اور کتاب کا نزول مقدر میں نہیں تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو جامع اور کامل اسوہ حسنہ بنایا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں افراد اور عام انسانوں کے لیے نمونہ ہیں، وہاں آپ کی ذات مبارکہ حکمرانوں کے لیے، فرمانرواؤں، فاتحین، جرنیلوں اور سربراہان مملکت کے لیے بھی نمونہ ہے۔ اس لیے اللہ کی حکمت اس کی متقاضی ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں نبوت اور حکمرانی دونوں کی صفات جمع فرمائی جائیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تبدیلی لائی، وہ انسانی تاریخ کی اتنی ہمہ گیر تبدیلی ہے جس کی مثال دنیا کی مدون تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ تبدیلی جس نے زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تربیت سے اصلاح پذیر نہ ہوا ہو اور اس کے اثرات اور ثمرات اور اس کے آثار و برکات اس نے قبول نہ کئے ہوں۔ اس ساری تبدیلی کے تحفظ کے لیے، اسلام کے تمدن کی بقا کو یقینی بنانے اور اسلامی تہذیب کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ریاست ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ریاست اور حکومت اسلام کا مقصد نہیں، بلکہ اسلام کی ضرورت ہے۔ اسلام کی منزل نہیں، نشان منزل ہے۔ اسی ضرورت کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ریاست قائم فرمائی، جو ہمیشہ کے لیے تمام ریاستوں کے لیے اسی طرح کا نمونہ ہے اور نمونہ رہے گی جس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہر انسان کے لیے نمونہ ہے۔ اس ریاست نے جو قوانین نافذ کئے وہ تمام قوانین کا سرچشمہ ہیں اور تمام قوانین کے لیے معیار اور مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں کفار کو دعوت دے رہے تھے تو آپ نے بارہا یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کو قبول کر لینے والے عرب و عجم کے حکمران بن سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ بہت ابتدائی دور میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم جناب ابو طالب زندہ تھے اور کفار مکہ کی طرف سے ابھی دشمنی اور مخالفت میں بہت شدت پیدا نہیں ہوئی تھی تو کفار مکہ نے چاہا کہ ابو طالب کے ذریعے مصالحت کی کوئی شکل نکل آئے اور افہام و تفہیم کی کوئی ایسی فضا بن جائے جس میں یہ کشیدگی اور یہ شدت ختم ہو جائے۔ ابو طالب نے اس پیشکش کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ مجھے اس سے زیادہ خوشی اور کس بات سے ہو سکتی ہے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے اور کفار مکہ کے بڑے بڑے نمائندہ سردار بھی آ گئے۔ ابو طالب نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی قوم کے لوگ کوئی بات کہنے آئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چچا! آپ جو بات پسند کرتے ہیں میں اس کے لیے تیار ہوں، آپ حکم فرمائیں۔ اس پر مکہ کے سرداروں نے اپنی بات کہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ بہت اہم ہے۔ غور کرنے کی بات ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان سے صرف ایک ایسے کلمہ پر ایمان لانے کی بات کرتا ہوں کہ اگر یہ لوگ اس کو مان لیں تو پورے عرب ان کے ماتحت ہو جائیں گے اور تمام عجم ان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔ یعنی عرب و عجم کی فرمانروائی اور برتری ان کو حاصل ہو جائے گی۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمائی جب اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ایک دو درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ مکہ سے باہر شاید ہی کوئی اسلام کے بارے میں کچھ جانتا ہو گا۔

اس کے بعد مکہ مکرمہ کے آخری دور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کے وفود سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ خاص طور پر جب حج کے موقع پر حضور دین کی دعوت دینے مختلف قبائل کی قیام گاہوں پر تشریف لے جا رہے تھے۔ تو اس موقع پر ہر قبیلہ سے آپ

فرماتے تھے کہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لو تو عرب اور عجم دونوں تمہارے زیر نگیں ہو جائیں گے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے ارشادات یہ بات واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اسلام کے مزاج اور پیغام میں پہلے دن سے ہی یہ عنصر موجود تھا، بلکہ وہ عناصر موجود تھے جن میں زندگی کی مکمل تبدیلی، نظام معاشرت کی مکمل اصلاح، فرد اور معاشرہ کے ساتھ ساتھ حکومت کی مکمل اصلاح ایک پروگرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تھا۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد ایک نیا اور اجنبی عنصر اسلام کی تعلیم میں شامل ہو گیا جو مکی دور میں شامل نہیں تھا، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔

مکہ کی شہری ریاست:

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا خاندان اور آپ کی ذات گرامی ایک ایسا بین الاقوامی مزاج اور کردار رکھتے تھے کہ جو عرب میں بہت کم لوگوں کو حاصل تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد جناب قصی جنہوں نے مکہ مکرمہ کی شہری ریاست قائم کی ان کے ذاتی تعلقات اپنے زمانے کے کئی حکمرانوں سے قائم تھے۔ ان کا بچپن اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ شام میں گزرا تھا۔ وہ وہاں کے حالات و معاملات سے اچھی طرح واقف تھے۔ غالباً شام میں طویل سکونت کی بناء پر ہی ان کو قیصر روم کے دربار میں بھی تعارف حاصل تھا۔ ان کے تعلقات یمن کے حکمرانوں سے بھی تھے۔ قصی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قریش کی تجارت کو مختلف علاقوں میں منظّم اور مرتب کیا اور ان کی انہی کوششوں اور تعلقات کی وجہ سے قریش کا تعارف بقیہ دنیا کے بہت سے حصوں میں ہوا۔ جناب قصی کو جب مکہ مکرمہ پر قبضہ بحال کر کے وہاں کا نظام بحال کرنے اور امن وامان قائم کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے ایک باقاعدہ شہری ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس ریاست کو قائم کرنے میں جناب قصی کو خاصی تگ و دو کرنی پڑی۔ انہوں نے قبیلہ خزاعہ سے جو کعبہ کی تولیت پر عرصہ سے زبردستی اور ناجائز طور پر قابض تھا، جنگ کی اور کعبہ کے انتظام سے ان کو بزور بازو بے دخل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ

جناب قصی کی اس مہم میں قیصر روم نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔

جناب قصی کی قائم کردہ اس شہری ریاست کا تذکرہ مغربی مصنفین نہیں کرتے۔ مغربی مصنفین جب سٹی اسٹیٹ کی بات کرتے ہیں تو صرف یونان یا زیادہ سے زیادہ روما کی بات کرتے ہیں۔ اگرچہ مغربی مصنفین مکہ کی شہری ریاست کا ذکر نہیں کرتے لیکن کسی کے تذکرہ نہ کرنے سے تاریخ کے حقائق نہیں بدل سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکہ کی شہری ریاست کئی سو سال تک قائم رہی۔

اس ریاست میں قصی نے پہلے دس شعبے قائم کئے اور ان کو قریش کے دس قبائل میں تقسیم کیا۔ پھر وقت کے ساتھ مزید شعبے قائم ہوتے گئے جو مختلف قبائل میں تقسیم کئے جاتے رہے۔ یوں کل اکیس عہدے قائم ہوئے۔ ہر قبیلہ کا سربراہ پیدائشی اور خاندانی طور پر اس عہدے کا حامل بھی ہوتا تھا، جو اس خاص قبیلے کا عہدہ تھا۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خاندان میں عدالتی ذمہ داری تھی اور خاص طور پر یہ ذمہ داری کہ اگر کوئی شخص قتل ہو جائے یا زخمی کر دیا جائے تو اس کی دیت یا تاوان ادا کرنے کا معاملہ۔ ایسے تمام مقدمات کا فیصلہ جناب صدیق اکبر کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خاندان میں سفارت کا عہدہ تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وزارت خارجہ کا عہدہ۔ دوسرے قبائل سے معاملہ اور گفتگو کے لیے جب قریش کی نمائندگی کی ضرورت ہوتی تھی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یا ان کے خاندان کے بزرگوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اسی طرح سے مختلف خاندانوں میں مختلف عہدے قائم تھے۔ بنی عبد الدار جو عرب کا ایک مشہور قبیلہ تھا وہ بیت اللہ کا متولی تھا اور بیت اللہ کی چابی بنی عبد الدار کے سربراہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ جناب قصی کا قائم کردہ یہ عہدہ آج تک قائم ہے۔ آج بھی اس وقت بنو عبد الدار ہی کے ایک سردار کے ہاتھ میں بیت اللہ کی چابی ہوتی ہے اور مکہ مکرمہ اور حجاز کا کوئی بھی چھوٹا یا بڑا حکمران آج تک اس خاندان سے بیت اللہ کی چابی واپس لینے کی ہمت نہیں کر سکا۔

یہ بات محض تاریخی اتفاق نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے ایک اور تصور بھی ہے۔ اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منور تشریف لے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں بھی ایک شہری ریاست قائم فرمائی۔ آپ کی قائم کردہ یہ نئی شہری ریاست مدینہ دراصل مکہ مکرمہ کی ایک جلاوطن حکومت تھی جو مدینہ منورہ میں قائم کی گئی۔ اس لیے کہ آپ نے انہی صحابہ کرام کو وہی عہدے وہاں بھی دیئے جو مکہ مکرمہ میں ان کے خاندانوں کو حاصل تھے۔ قاضی کا منصب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا۔ بیرونی سفارت کی ذمہ داری حضرت عمر فاروق کو کئی مرتبہ سونپی گئی۔ بقیہ معاملات میں جہاں جہاں متعلقہ قبائل سے اگر صحابہ موجود تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ ذمہ داریاں انہوں نے ہی انجام دیں۔

جناب قصی کے بعد ان کے جانشینوں میں سب سے نامور اور غیر معمولی شخصیت جناب ہاشم بن عبد مناف کی تھی۔ جلد ہی انہوں نے ریاست مکہ کے سربراہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ وہ بڑی مشہور اور بین الاقوامی شخصیت تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کے والد تھے۔ جناب ہاشم اس اعتبار سے بڑے نمایاں ہیں کہ نہ صرف عرب کے قبائل میں بہت معتبر تھے بلکہ قیصر روم کے دربار میں براہ راست شناسائی رکھتے تھے۔ قیصر روم ان کی شخصیت سے متاثر تھا۔ جب وہ تجارت کا قافلہ لے کر شام جاتے اور قیصر روم شام میں ہوتا تو وہ ملاقات کے لیے جناب ہاشم کو بلایا کرتا اور ایک روایت میں آتا ہے کئی مرتبہ بعض معاملات میں ان کی ذہانت اور سمجھ بوجھ کی وجہ سے ان کی رائے بھی لی۔ جناب ہاشم نے قریش کے قبیلہ کے لیے روم کی سلطنت سے بہت سی مراعات حاصل کیں۔ یمن میں ایرانیوں کی جو کالونیاں تھیں، وہاں سے بھی قریش کے لیے رعایتیں حاصل کیں۔ اس طرح آس پاس کی دوسری ریاستوں مثلاً حبشہ سے مراعات حاصل کیں۔ یہ تمام مراعات اور سہولتیں قبیلہ قریش کو جناب ہاشم کی وجہ سے حاصل ہوئیں۔

پہلی مرتبہ مدینہ منورہ سے آنے والے ایک صاحب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ اور تعلق پیدا ہوا۔ یہ صاحب سوید بن صامت تھے جو مدینہ میں اپنی تعلیم اور صلاحیتوں کی وجہ سے الکامل کی وجہ سے مشہور تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے دعوت پیش کی۔ انہوں نے توجہ سے بات سنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں دلچسپی لی۔ ان کے پاس حکمت لقمان کے کچھ اجزا لکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا میرے پاس بھی اس طرح کی چیز ہے جو آپ بیان فرمارہے ہیں۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول تو نہیں کیا، لیکن مخالفت بھی نہیں کی۔ اس کے بعد سوید بن صامت کا انتقال ہوگیا۔ سیرت نگاروں میں اس پر بحث ہوتی رہی کہ سوید بن صامت اسلام قبول کرچکے تھے یا نہیں۔ اور کیا ان کو مسلمان سمجھا جائے یا نہیں۔

اس کے بعد غالباً اس سے اگلے سال مدینہ منور کا ایک اور گروہ مکہ مکرمہ حج کرنے کے لیے آیا۔ یہ قبیلہ اوس کی ایک شاخ بنو عبد الاشہل کے کچھ لوگ تھے۔ یہ قریش مکہ سے ایک معاہدہ کرنا چاہتے تھے، جس کے مطابق خزرج کے ساتھ لڑائی میں قریش مکہ اوس قبیلہ کا ساتھ دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس بھی بات کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ انہوں نے بہت غور سے آپ کی بات سنی۔ اخلاق سے پیش آئے۔ اور کہا کہ ہم اس وقت تو ایک اور کام کے لیے آئے ہیں، اس لیے اس موقع پر ہم کسی اور کام پر توجہ نہیں دے سکتے۔ انہوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات قبول نہیں کی۔

بیعت عقبہ اور مدینہ کی ریاست کی بنیاد:

اہل مدینہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا با قاعدہ رابطہ اس وقت ہوا جب نبوت کے گیارھویں سال مدینہ منورہ سے آنے والے چھ حجاج کرام کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی۔ چھ کے چھ افراد نے اسلام قبول کیا اور مدینہ چلے گئے۔ بعض لوگوں نے اس کو پہلی بیعت عقبہ قرار دیا ہے۔ بعض دوسرے حضرات نے اس کو بیعت قرار نہیں دیا

کیونکہ اس موقعہ پر کسی باقاعدہ بیعت کا ذکر نہیں ملتا۔ کسی سیرت نگار نے ان حضرات کی بیعت کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا ہے ،بلکہ صرف قبول اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے۔ان حضرات نے واپس جا کر مدینہ منورہ میں دعوت اور تبلیغ کا کام کیا۔ اگلے سال جب یثرب کے لوگ حج کے لیے آئے تو بارہ حضرات کا ایک باقاعدہ وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان بارہ میں سے پانچ حضرات تو پچھلے سال والے تھے اور سات افراد نئے تھے۔ ان بارہ افراد نے باقاعدہ اسلام قبول کیا۔ بیعت کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ کسی مبلغ کو بھیجیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ ان کا تعلق بھی بنی عبد الدار سے تھا۔ انہوں نے مدینہ جا کر اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی۔ ان کی تبلیغ بہت موثر اور کامیاب ثابت ہوئی۔ جلد ہی مدینہ منورہ کے ہر گھر، خاندان اور برادری میں اسلام کا نام اور چرچا پھیل گیا۔ بڑی تعداد میں لوگ مسلمان بھی ہو گئے۔ اس کے اگلے سال ۷۲ افراد اسلام قبول کرنے کے ارادے سے بقیہ حجاج کے ساتھ آئے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ بیعت کی اور عقبہ کے مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو تین ملاقاتیں کیں۔ عقبہ وہ جگہ ہے جب آپ منیٰ سے مکہ مکرمہ کی طرف آئیں تو دائیں طرف ایک بہت اونچا پہاڑ ہے جس کی شکل دیوار کی سی ہے۔ اس کے اندر ایک راستہ جاتا ہے جہاں ایک مسجد ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں یہ ملاقاتیں ہوئیں۔

یہ بات بڑی دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان ملاقاتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب بھی موجود تھے۔ اس لیے جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ بہت ابتدا میں اسلام قبول کر چکے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور مشورہ ہی سے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، ان کی رائے کی اس سے تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد مدینہ کے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ اپنے صحابہؓ کو ہمارے ساتھ جانے کی ہدایت دیں اور خود بھی مدینہ تشریف لے آئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ہجرت کر کے مدینہ جانے کی اجازت دے دی۔ صحابہ ایک ایک کر کے مدینہ منورہ جانے لگے۔ یہ جو معاہدہ ہوا، جس میں باقاعدہ بیعت بھی ہوئی اس کو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بیعت "بیعت حرب" کہلاتی ہے۔ پہلی بیعت "بیعت النساء" کہلاتی ہے۔ بیعت النساء کے لفظی معنی تو ہیں عورتوں کی بیعت۔ لیکن عورتوں کی بیعت سے مراد بیعت کے وہ الفاظ ہیں جو سورۃ ممتحنہ میں آئے ہیں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ جب آپ خواتین سے بیعت کریں تو فلاں فلاں چیزوں کی بیعت لیں۔ خواتین چونکہ میدان جنگ میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ نہ ان سے یہ وعدہ لینا مناسب تھا کہ وہ میدان جنگ میں جا کر لڑیں۔ اس وجہ سے ان سے جنگ میں حصہ لینے کی بیعت نہیں لی جاتی تھی۔ اس لیے جنگ کے علاوہ اور چیزوں کی بیعت کو بیعت نساء کہا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلی بیعت کو بیعت نساء کے نام سے یاد کیا گیا۔

دوسری بیعت میں انصار مدینہ نے یہ وعدہ کیا کہ ہم آپ کا دفاع بھی کریں گے۔ آپ کے لیے لڑیں گے۔ جو آپ پر حملہ آور ہوگا اس کو ہم اپنے اوپر حملہ آور سمجھیں گے اور آپ کے ساتھ ہر سرد و گرم میں مل کر رہیں گے۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر چیز میں ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ جب یہ بیعت ہو گئی تو بعض انصاری صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے ہاتھوں مکہ فتح کر دے تو آپ واپس مکہ چلے جائیں اور ہمیں چھوڑ دیں؟ انہوں نے مناسب انداز میں یہ سوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا۔ جواب میں آپ مسکرائے اور فرمایا: میرا خون تمہارا خون، تمہارا خون میرا خون، تمہاری صلح میری اور میری صلح تمہاری صلح۔ اب تمہارے ساتھ مرنا جینا ہوگا۔ جس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

آج سیاست و ریاست کے سیاق و سباق میں سوشل کنٹریکٹ کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں۔ روسو کے زمانے سے ہو رہی ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یورپ میں کوئی ریاست کسی باقاعدہ کنٹریکٹ کی بنیاد پر قائم ہوئی یا نہیں ہوئی۔ کوئی تاریخی ثبوت ایسا نہیں ہے کہ کسی

حکمران کے ساتھ ریاست کے قیام سے پہلے کوئی معاہدہ کیا گیا ہو اور اس معاہدہ کے نتیجہ میں کوئی ریاست قائم ہوئی ہو۔ یورپ کے بر عکس یہاں تمام سیرت نگار اور مورخین متفق ہیں کہ دو مرتبہ معاہدہ ہوا۔ ۷۲ آدمی جو نہ صرف اپنے اپنے قبائل کے نمائندہ تھے، بلکہ اتنے نمایاں افراد تھے کہ پہلے سے وہاں سرداری کا مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے قبیلہ کی طرف سے معاہدہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توثیق فرمائی اور اس کے نتیجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے۔ یہ ایک ایسی ریاست تھی جو ایک آزادانہ سوشل کنٹریکٹ کے نتیجہ میں وجود میں آئی۔

مدینہ کی ریاست اور بقیہ ریاستوں میں ایک دوسرا بڑا اہم فرق یہ ہے کہ جب ریاست بنتی ہے تو اس کو چلانے کے لیے قانون کی ضرورت پڑتی ہے۔ گویا ریاست مقصد ہے اور قانون اس کو چلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہاں اس کے بر عکس ہے۔ یہاں ایک قانون الٰہی نازل ہو رہا تھا۔ ایک شریعت دی جا رہی تھی۔ اس شریعت کے بعض احکام مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکے تھے۔ اس شریعت کے نفاذ اور تحفظ کے لیے ریاست کی ضرورت تھی۔ یہاں قانون اصل چیز تھی اور ریاست ذریعہ تھی۔ لہٰذا شریعت اصل مقصود ہے اور ریاست اس کا ذریعہ ہے۔ اسلام میں ریاست مقصود نہیں ہے۔ اسلام میں ریاست حصول مقصد کا ایک اہم اور ضروری وسیلہ ہے۔ لہٰذا اسلام میں ریاست کا درجہ بعد میں ہے۔ شریعت کا درجہ پہلے ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو بیعت عقبہ تھی اور جس میں ریاست کی بنیاد رکھی گئی یہ اسلامی ریاست کا روز آغاز تھی۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۳ نبوت کو یا اس کے فوراً بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ اگر ریاست مدینہ کے آغاز کی تاریخ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہنچنے سے پہلے شمار کی جائے تو وہ نبوت کے گیارہویں سال ذی الحجہ کی تیرہویں تاریخ ہو گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے شمار کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس معاہدہ کے نتیجے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آئندہ ریاست مدینہ کا سربراہ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اسلامی قوانین پر چلنے کا عہد و پیمان ہو چکا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ کارندے وہاں ذمہ داریاں سنبھال چکے تھے۔ اس لیے ریاست تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ صحابہ کرام جانا شروع ہو گئے، جو صحابی وہاں پہنچتے گئے، انہوں نے وہاں ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۱ ذی الحجہ سن ۱۳ نبوی کو مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم ہو گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سربراہ کے طور پر بعد میں وہاں تشریف لے گئے۔

ریاست مدینہ کے قیام کا طریقہ کار

مدینہ منورہ جانے سے پہلے جو بیعت ہوئی اس کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو اس میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک سیاسی اور ریاستی بندوبست کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ انصار مدینہ نے طے کیا کہ ہم ہر معاملہ میں آپ کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے، یعنی سمع و طاعت۔ آپ کے ارشادات قانون کا درجہ رکھیں گے اور ہم ان کی پیروی کریں گے۔ پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے اپنی ذمہ داری انجام دیں گے۔ آپ کے احکام کو بجالانے میں ہم اپنی قوت استعمال کریں گے، جو حق کا معاملہ ہوگا اس میں صرف حق کی پیروی کریں گے اور کسی قبائلی عصبیت کا ساتھ نہیں دیں گے۔ حق کے معاملہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور سے خوف نہیں کھائیں گے۔

معاہدہ کے نتیجہ میں مدینہ میں ایک چھوٹی سی کامن ویلتھ قائم ہو گئی۔ کامن ویلتھ اس لیے کہ یہ ایک قبائلی معاشرہ تھا، ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائلی یونٹوں کو ختم نہیں کیا، بلکہ ہر قبیلہ میں عریف اور نقیب مقرر فرمائے تاکہ اس قبیلہ کی طرف سے بات کر سکیں۔ پھر جب مہاجرین مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے نمائندے بھی مقرر فرمائے۔ اس طرح سے الگ الگ یونٹ قائم ہو گئے۔ ان یونٹوں کے باہمی اتحاد سے ایک ایسی دولت مشترکہ وجود میں آگئی جو داخلی طور پر خود مختار یونٹوں پر مشتمل تھی۔

مدینہ منورہ کا محل وقوع:

یہ جزیرہ نمائے عرب کے وسیع سلسلہ ریگستان میں واقع ایک چھوٹا سا نخلستان تھا۔ حجاز اور تہامہ جو مغربی عرب کے دو بڑے صوبے ہیں، قریش کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہ عموماً پہاڑی اور ریگستانی علاقے پر مشتمل ہیں۔ ان علاقوں میں جابجا چھوٹے چھوٹے نخلستان

پائے جاتے ہیں۔ ان میں نسبتاً ایک بڑا نخلستان تھا جس کو مدینۃ النبی اور دارالہجرت ہونے کا لازوال شرف حاصل تھا۔

یہ نخلستان ایک ایسے خطہ میں واقع ہے جہاں ایک طویل زمانے تک ایک بہت بڑے لاوے کی چٹانیں پھٹتی رہتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے دس یا بارہ سال پہلے بھی لاوے کی چٹانیں پھٹنے کے اثرات آج چودہ سو چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی مدینہ منورہ جانے والوں کو نظر آتے ہیں۔ یہ لاوے کی چٹانیں وہ ہے جس کو عربی میں "لابہ" کہا جاتا ہے۔ لاوا شاید اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ ایک مشہور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح ابراھیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے قرب و جوار کو حرم قرار دیا تھا، اسی طرح میں مدینہ کو حرام قرار دیتا ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم مدینہ کی حدود مقرر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ما بین لابتی المدینہ" یعنی میں مدینہ کے دونوں لابوں کے درمیان سرزمین کو مقدس اور محترم قرار دیتا ہوں۔ یہ لابہ کب پھٹا تھا یا کب سے پھٹنا شروع ہوا تھا، اس بارے میں بہت سے مورخین نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

علامہ سمہودی نے "وفاء الوفاء" میں لاوے کے بارے میں خاصی معلومات دی ہیں، اس لاوے کے پھٹنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ کے قرب وجوار کی زرخیزی میں اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں کی سرزمین کے اندر سے معدنیات نکال کر مدینہ منورہ کی سرزمین پر ڈال دیں، جس سے وہاں کی پیداوار بہت زیادہ بڑھ گئی، اور آج تک عرب کی سرزمین میں مدینہ کی زرخیزی ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔

یہ علاقہ جس کے رقبہ اور وسعت کے بارے میں پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کی لمبائی تقریباً بارہ سے چودہ میل تک اور چوڑائی آٹھ سے دس میل تک ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی مختلف بستیوں پر مشتمل تھا، جن کی تعداد بیس بائیس بتائی جاتی ہے۔ ہر بستی میں چھوٹے چھوٹے قلعے یا گڑھیاں موجود تھیں جن کا تذکرہ مدینہ منورہ کے تقریباً تمام تاریخ نویسوں نے کیا ہے۔

ان قلعوں کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے آثار اب بھی مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔ خاص طور سے کعب بن اشرف یہودی کا قلعہ مدینہ منورہ سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر اب بھی موجود ہیں، اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آطام کی نوعیت کیا تھی۔ یہ آطام جس کے اندر بستی کا سربراہ اور قبیلہ کے دیگر ذمہ داران رہتے تھے، ایک خود کفیل یونٹ ہوتا تھا، بعض صورتوں میں اگر اُطم بڑا ہوتا تھا تو پورا قبیلہ اس میں رہتا تھا۔ اس کے باہر کی سرزمین جو اکثر و بیشتر باغات اور کھیتوں پر مشتمل ہوتی تھی، وہ اس قبیلہ یا اطم میں رہنے والوں کی ملکیت ہوتی تھی۔ اسی اطم میں اسلحہ خانہ بھی ہوتا تھا، ضرورت کی چیزیں محفوظ کرنے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔

یہ چھوٹی چھوٹی بستیاں جو اس رقبہ پر پھیلی ہوئی تھیں، بعد میں ان سب کا نام مدینۃ النبی قرار پایا۔ تاہم یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ان میں ایک گاؤں یثرب کہلاتا تھا۔ یثرب جغرافیائی اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور آبادی کے لحاظ سے بڑا بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج مدینہ کہلائے جانے والے پورے علاقہ کو اس دور کی عام بول چال میں یثرب کہا جاتا تھا۔

الغرض جس شہر کو مدینہ منور کا نام دیا گیا یہ کوئی ایک شہر نہیں تھا۔ بلکہ یہ بہت سی بستیوں کا مجموعہ تھا۔ یہ ایک بہت بڑا رقبہ تھا جس کے بارے میں یہ اندازہ درست ہو گا کہ وہ موجودہ اسلام آباد کے برابر رقبہ تھا۔ اس کا طول تقریباً تیرہ چودہ یا شاید پندرہ میل کے قریب تھا۔ عرض دس بارہ میل کے درمیان تھا۔ تمام سیرت نگاروں نے اس کی شمالی اور جنوبی حد جبل احد اور جبل عیر کو قرار دیا ہے۔ جبل عیر سے پرے آج کل مدینہ کا آئر پورٹ ہے۔ ائر پورٹ سے شہر کی طرف جاتے ہوئے راستے میں جبل عیر پڑتا ہے۔ جبل احد اور جبل عیر کے درمیان شمالاً جنوباً یہ حد ہے اور شرقاً غرباً بھی دس بارہ میل کا علاقہ ہے۔ اس علاقہ میں یہ سارے گاؤں اور چھوٹے چھوٹے قلعے تھے۔ ان کے لیے آطام کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ یہ قلعے اس نوعیت کے جس کو اردو میں گڑھی کہتے ہیں۔ گڑھی سے مراد ایک ایسی بڑی حویلی ہے

جو دفاعی طور پر مضبوط بنائی گئی ہو۔ جس کے اندر ایک سے زائد خاندان رہتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ بھی وہاں رہتا ہو اور کچھ لوگ باہر زمینوں پر رہتے تھے۔ اس طرح کے تقریبا ۲۷ آطام مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں موجود تھے۔ اس وقت بھی بعض آطام (قلعوں) کے اثرات مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔ اگر آپ وہاں تشریف لے جائیں تو کعب بن اشرف کے اطم کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ کعب بن اشرف یہودی کا قلعہ مسجد نبوی سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہے۔ خود شہر مدینہ کے اندر بھی بعض آطام کے آثار موجود ہیں۔ اس طرح بعض باغات ابھی تک موجود ہیں۔ گویا کیفیت یہ تھی کہ ایک بہت بڑا باغ ہے جو ایک قبیلہ کی ملکیت ہے۔ اس باغ کے درمیان میں یا اس کے ایک طرف بڑی حویلی قائم ہے، جس میں وہ سارا قبیلہ یا خاندان رہتا تھا، ان کے اندر بستی اور قبیلہ کا سربراہ اور قبیلہ کے دیگر ذمہ دار بھی رہتے تھے۔ یہ ایک خود کفیل یونٹ ہوتا تھا، اس کے باہر قبیلے کی سرزمین جو اکثر و بیشتر باغات اور کھیتوں پر مشتمل ہوتی تھی وہ اس قبیلہ اور اطم میں رہنے والوں کی ملکیت ہوتی تھی، اسی اطم میں اسلحہ خانہ بھی ہوتا تھا اور ضرورت کی دیگر چیزیں بھی محفوظ کرنے کا انتظام اس میں ہوتا تھا۔ اس پورے رقبہ میں ان اطام کے علاوہ بارہ پندرہ چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ ان میں سے ایک گاؤں کا نام یثرب تھا جو نسبتاً بڑا گاؤں تھا۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی اس پورے علاقے کو یثرب کہا جاتا تھا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں وہ بھی تھا، جس میں آج مسجد نبوی موجود ہے۔ یہ گاؤں بنو مالک بن نجار کی ملکیت تھی۔ وہاں ایک خالی جگہ دو یتیموں کی ملکیت تھی، جو حضور نے معاوضہ دے کر خرید لی اور وہاں مسجد نبوی تعمیر کی گئی۔ اس پورے علاقہ کا نام مدینہ النبی یا مدینہ قرار پایا۔

مدینہ منورہ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ تمام بلکہ باہم متحارب اور مختلف قبائل کی بنیاد پر ایک ریاستی نظم و نسق قائم کیا گیا ہے۔ اس کی سربراہی اتفاق رائے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنبھالی اور یوں اس طویل جنگ اور ابتلا کی روایت ختم ہو گئی جو مدینہ منورہ کے مختلف قبائل کے مابین جاری تھی۔ ہجرت سے سات آٹھ سال قبل ایک جنگ شروع ہوئی تھی۔ یہ جنگ بعاث کہلاتی تھی۔ کئی سال جاری رہی اور اوس اور خزرج کے قبائل آپس میں

شمشیر آزما ہوئے۔

یہودیوں کے کچھ قبائل نے اوس کا ساتھ دیا اور کچھ قبائل نے خزرج کا ساتھ دیا۔ کئی سال بعد ہجرت سے تقریباً چار پانچ سال پہلے کہیں جا کر یہ جنگ ختم ہوئی۔ اسی جنگ سے مایوس ہو کر اوس اور خزرج کے بعض لوگوں نے یہ تجویز دے رکھی تھی کہ ہمیں ایک مشترکہ سربراہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کی تجویز کے مطابق وہ منتخب سربراہ عبد اللہ بن ابی ابن سلول تھا جو بعد میں منافقین کا سردار کہلایا۔ اس کی مشترکہ سرداری یا بادشاہی کا معاملہ باقاعدہ طے تو کیا ہوا تھا، لیکن تجویز زیر غور تھی۔ بعض لوگ متفق تھے اور بعض نہیں۔ یقیناً عبد اللہ بن ابی ابن سلول اور اس کے رفقاء کی یہ کوشش ہوگی کہ تجویز پر عمل ہو جائے۔ اسی اثناء میں ہجرت کا واقعہ پیش آگیا اور جتنے انصاری صحابہ یعنی اوسی اور خزرجی تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور وہ حیثیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گئی جو بعض لوگوں کے خیال میں عبد اللہ بن ابی ابن سلول کے لیے سوچی جا رہی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے ہی مدینہ منورہ کا داخلی نظم و نسق طے فرما دیا تھا۔ جو مہاجرین تھے وہ مختلف انصاری خاندانوں کے ساتھ ان کے خاندانوں کے فرد قرار پائے۔ انصاری خاندانوں میں بارہ نقیب پہلے ہی مقرر کر دے گئے تھے۔ سعد بن عبادہ خزرج قبیلے کے نقیب النقباء کہلائے۔ جو بقیہ نقباء منتخب کے گئے اور جن کو ان کے قبیلوں نے پہلے ہی منتخب کیا تھا، وہ سب کے سب ایسے لوگ تھے جو پہلے سے ہی اپنی اپنی قوم میں سرداری کا مقام رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت براء بن معرور کے بارے میں ابن ہشام کی روایت ہے کہ ان کے بارے میں لوگوں نے کہا کہ: هُوَ سَيِّدُنَا وَشَرِيفُنَا وَابنُ سَيِّدِنَا وَابنُ شَرِيفِنَا

"وہ ہمارے سردار بھی ہیں، باعزت آدمی ہیں، ہمارے سردار کے بیٹے ہیں اور شریف آدمی کے بیٹے ہیں"۔

اس طرح سے جب یہ سارا مقامی بندوبست مکمل ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے۔

قیام ریاست کے لیے ابتدائی تین کام:

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے آپ نے تین کام کیے۔

۱۔ مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی۔ اس سے پہلے قبا میں مسجد قبا کی تعمیر ہوئی تھی۔

۲۔ اس کے بعد آپ نے مواخاۃ کا عمل مکمل فرمایا۔ جتنے مہاجرین مکہ مکرمہ سے آئے تھے ان کو مدینہ کے خاندانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ مواخاۃ دراصل ایک قدیم عرب ادارہ کے احیاء کا ایک نیا انداز تھا۔ یہ ولاء کے نام سے عرب میں رائج تھا۔ اسلام کے بعد بھی رائج رہا۔ ولاء سے مراد یہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص اگر چاہے تو اپنے قبیلے سے تعلق ختم کر کے کسی دوسرے قبیلہ سے تعلق جوڑ سکتا تھا۔ اگر دوسرا قبیلہ قبول کر لے تو وہ شخص پھر اس دوسرے قبیلہ کا فرد بن جاتا تھا۔ اس کو ولاء کا تعلق کہا جاتا تھا۔ جو شخص اس طرح کا تعلق قائم کرتا تھا اس کو مولیٰ الموالات کہلاتا تھا۔ یعنی وہ شخص جو ولاء کے ذریعے مولا بنا ہو۔ مولیٰ کے معنی دوست، تعلق رکھنے والا، مدد کرنے والا، مدد کی توقع رکھنے والا، یہ سب معنی مولیٰ کے لفظ کے ہیں۔

۳۔ تیسرا کام حضور نے یہ کیا کہ ایک چارٹر مرتب فرمایا جس کو بعض مورخین نے میثاق مدینہ کا نام دیا ہے۔ بعض نے اس کو معاہدہ کہا ہے۔ اس کے قدیم ترین راویان مثلاً امام ابو داؤد، امام احمد بن حنبل اور سیرت نگاروں میں ابن ہشام اور ابن سعد اور مورخین میں کئی افراد نے اس کے لیے کتاب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

كِتَابُ رَسُولِ اللهِ صَلى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرِيْنَ يَا بَيْنَ الْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرِيْن

کتاب کا عربی ترجمہ فیصلہ یا چارٹر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں کتاب کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے: لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللهِ "اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نہ آچکا ہوتا"، اسی طرح "كَلَّا اِنَّ كِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّيْنَ كَلَّا اِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّيْنَ وغیرہ" لہٰذا کتاب کا لفظ قرآن

پاک میں جہاں کہیں بھی کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور مفہوم میں آیا ہے اس سے مراد فیصلہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ یقیناً اس چارٹر کو جاری کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل سے بات کی اور چارٹر کی تفصیلات ان کے مشورہ سے طے کیں۔ جب انصار کے ذمہ داروں سے ابتدائی گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی گھر میں ہوئی تھی۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے جب یہ معاہدہ ہو رہا تھا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ حضور ایک ایک جملہ املا فرماتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا۔ میرا گھٹنا اور حضور کے گھٹنے کے نیچے تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب یہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پوری کوشش اور جدوجہد کا منشا فقط یہ تھا کہ خدائے واحد ہی کا بول بالا ہو۔ اور ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آئے، جس میں ظلم معدوم ہو۔ ہر شخص اعتقاد کی کامل آزادی سے بہرہ ور ہو۔ دنیا سے بدامنی و فساد دور ہو تاکہ ہر شخص کو اپنی قابلیت کے مطابق خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ سے زیادہ استفادے کا موقع ملے اور نیز محتاجوں کو ممکنہ حد تک حکومت کی جانب سے امداد دی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن اسی طرح پورا ہو سکتا تھا کہ تمام انسان ایک مذہبی و سیاسی معاشرے یعنی حکومت کے تحت لائے جائیں، جس کے بغیر امن انتظام اور خودداری ممکن نہیں۔

مسجد نبوی اور اس کا نظام

مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے حوالے سے پچھلے ہفتے کالم میں یہ تذکرہ ہوا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے جو تین کام کئے تھے ان میں سے پہلا کام مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر تھی اس مضمون میں تعمیر مسجد اور بعد میں اس مسجد میں جو نظام رائج تھا اور مسجد نبوی کا ایک نئے معاشرے کی تعمیر میں جو کردار ادا کیا تھا، اس پر تبصرہ ہوگا۔

تعمیر مسجد قباء:

الغرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچے تو آپ قبیلہ بنو عمرہ کے مسکن قباء میں اترے اور یہاں سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی تاکہ صحابہ کرام اس میں جمع ہوں، نمازیں ادا کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشاورت ہوتی رہے۔ قباء اس بستی کا پرانا نام ہے کیونکہ یہاں قباء نام ایک کنواں تھا۔ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند دن قیام فرمایا ہے، اس مسجد کا قرآن مجید میں اس طرح تذکرہ ہوا ہے۔

"جو مسجد روز اول سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں، اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں"۔ [سورۃ توبہ]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد کے قبلے کی جگہ میں پہلا پتھر رکھا، پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پتھر رکھے۔ پھر انصار اور مہاجرین اس کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوئے اور جلد ہی اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم از خود پتھر اور مٹی اٹھانے میں شریک تھے۔ اس طرح بہت جلد سادہ سی مسجد قباء تیار ہو گئی۔ اس کا فرش پتھروں کا، منبر کھجور کے تنے کا اور چھت

کھجور کے پتوں کی تھی اور اکثر حصہ کھلا تھا۔

مسجد قباء کی فضیلت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلصَّلٰوۃُ فِی مَسْجِدِ قُبَاءٍ کَعُمْرَۃٍ مَنْ تَطَھَّرَ فِی بَیْتِہٖ ثُمَّ اَتٰی مَسْجِدَ قُبَاءٍ فَصَلّٰی فِیْہِ صَلٰوۃً کَانَ لَہٗ کَاَجْرِ عُمْرَۃٍ [حدیث]

''مسجد قباء میں نماز ادا کرنا ایسے ہے جیسے ایک عمرہ کرنا'' اور فرمایا: ''ایک شخص نے اپنے گھر میں وضو کیا پھر مسجد قبا آکر اس میں نماز پڑھی تو اس کے لیے ایک عمرے کا اجر ہے''۔

تعمیر مسجد نبوی:

مسجد قباء کی بنیاد رکھنے کے بعد آپ مدینہ کے وسط میں تشریف لائے اور موجود روضۃ مبارک کی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کے بیٹھنے پر قیام اختیار کیا اور فوری طور پر مسجد تعمیر کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ مختصر طور پر اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے منورہ کے وسط میں تشریف لائے اور جہاں آپ کی اونٹنی قصواء بیٹھی تھی تو آپ نے وہاں سب سے پہلے مسجد کی تعمیر شروع کی۔ یہ زمین کا ٹکڑا سہل اور سہیل نامی دو انصاری یتیم بچوں کی ملکیت تھی جو حضرت اسعد بن زرارہؓ کی پرورش میں تھے جو نقیب محمدی تھے، زہیری نے اعلان المساجد میں لکھا ہے کہ حضرت اسعدؓ اس جگہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے نماز پڑھتے تھے۔ اس میں کھجوروں وغیرہ کا کھلیان ہوتا تھا نیز اس میں چند کھجوروں اور غرقد کے درخت اور کچھ مشرکین کی قبریں تھیں اور یہ ناہموار جگہ تھی۔ آپ نے ان سے اس کے سودے کی بات کی تو انہوں نے اس کو ہبہ کرنا چاہا۔ نیز قبیلہ بنو نجار نے قیمت ادا کرنے کی اجازت چاہی لیکن آپ نے یہ دونوں باتیں منظور نہیں فرمائیں اور سونے کے دس دینار پر اسے خرید لیا، یہ رقم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ادا کی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے مل کر مسجد کی تعمیر شروع کی اس کی تعمیر میں کچھ پتھر، کچی اینٹیں، اور کھجور کے تنے استعمال کیے، یہ تنے ستونوں کے طور پر کھڑے کیے

گئے اور چھت کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں سے بنائی گئی تھی، مسجد کی تعمیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اینٹ، پتھر خود بھی اٹھا کر لاتے تھے اور اپنی زبان مبارک سے فرماتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرِ [حدیث]

"الٰہی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، تو انصار اور مہاجرین کو بخش دے"۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی اینٹ رکھتے اور شعر رجز میں پڑھتے تھے:

لَئِنْ قَعَدْنَا وَالرَّسُوْلُ يَعْمَلُ فَالْعَمَلُ الْعَمَلُ الْمُضِلُّ

"رسول اللہ کام کریں اور ہم بیٹھے رہیں تو یہ بڑی ہی گمراہی کا کام ہے"۔

مسجد کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں اور تین گز بلند تھی۔ابتدا میں یہ مسجد ستر ہاتھ لمبی اور ساٹھ ہاتھ چوڑی بنائی گئی اور تین دروازے یعنی باب جبریل، باب نساء، اور باب رحمت رکھے گئے جو آج تک اس جگہ پر انہیں ناموں سے مشہور ہیں۔

صحابہ کرامؓ اور تعمیر مساجد:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو ہر بستی، قبیلے، عشیرے اور ہر گاؤں میں مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔اوس اور خزرج دونوں قبائل میں کوئی بطن ایسا نہیں تھا جس میں کافی تعداد میں خاندان اور افراد مسلمان نہ ہو گئے ہوں۔یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے ڈیڑھ دو سال کے اندر اندر مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ منورہ میں نو مساجد قائم ہوئیں۔ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے کا فاصلہ بارہ پندرہ میل ہو اور چوڑائی آٹھ دس میل ہو تو وہاں کے سب رہنے والوں کے لیے مسجد نبوی میں پانچ وقت حاضری ممکن نہیں تھی۔آپ نے پڑھا ہو گا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت تھا اور طبیعت مبارک چند لمحوں کے لیے بہتر ہو گئی،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ اٹھا کر مسجد نبوی میں دیکھا تو صحابہ خوش ہوئے۔عام طور پر لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اب صحت مبارک اچھی ہو رہی ہے۔اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر

جانے کی اجازت مانگی، کیونکہ وہ کئی دن سے گھر نہیں گئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے ہجرت کے بعد ایک انصاری خاتون خارجہ بنت زید سے شادی کی تھی، ان کا مکان مسجد نبوی سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ قباء کے قریب عوالی نام کی ایک بستی تھی جس میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور یہ خاتون رہتی تھی۔ یہ جگہ مسجد نبوی سے ساڑھے تین چار کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اسی طرح سے مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مختلف جگہوں پر قیام پذیر تھے اور ہر جگہ ایک نہ ایک مسجد موجود تھی۔ ان نو مسجدوں کی تعداد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آٹھ سالہ مدنی زندگی میں غزوہ بدر کے بعد سے لے کر دنیا سے تشریف لے جانے تک اضافہ ہوتا رہا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ میں چالیس مساجد قائم ہو چکی تھیں، جن کا تذکرہ مورخین اور سیرت نگاروں نے کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرح مسجد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فرمودات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی عملی سیرت سے مسجد کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ وہ حضرات مسجد کی ضرورت اور اس کے مقام سے خوب واقف تھے۔ لہٰذا انہوں نے مسجد کے بارے وہی طریقہ اور وطیرہ اختیار کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ اس لیے ان کی زندگیوں میں مسجد کے بارے کچھ باتیں مشترکہ پائی جاتیں ہیں۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی مسجد سے گہری وابستگی تھی، مسجد تعمیر کرنا، آباد کرنا، مسجد میں جا کر نماز ادا کرنا، مسجد سے متعلق کاموں کا انجام دینا اور ہر طرح سے اس کا حق ادا کرنا ان کا شیوہ تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے مساجد کی تعمیر میں خصوصی حصہ لیا۔ چنانچہ اپنی حویلیوں (ایک خاندان کے گھروں کا مجموعہ) محلوں اور باغات میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس طرح وہ صحابہؓ جو حکومتی ذمہ داریوں اور کلیدی عہدوں پر تھے، انہوں نے خاص طور دار الحکومت کے ساتھ مساجد تعمیر کرائیں۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی

درجنوں مسجدیں مدینہ منورہ میں تعمیر ہو چکی تھیں۔ یہ تعداد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کئی گنا بڑھ گئی۔

آج بھی صحابہ کرام کے نام سے سینکڑوں وہ مساجد موجود ہیں جن کی بنیاد انہوں نے رکھی تھی۔ یہ مساجد ہر اس خطے میں پائی جاتی ہیں جہاں ان کے بابرکت قدم پڑتے تھے اور صحابہ کے نام سے تو لاکھوں مسجدیں دنیا میں قائم و دائم ہیں۔ یہ مسجد کی تعمیر میں ان کی دلچسپی و شغف کا مظہر ہے۔

جب مسلمان مجاہدین جہاد کے لیے جاتے تو جہاں چھاؤنی بناتے وہاں پہلے مسجد بناتے بعض اوقات عارضی قیام ہوتا تو سرکنڈوں کی مسجد بنالیتے اور وہاں سے کوچ کرتے تو اسے اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے۔ جہاں انہوں نے مستقل آبادیاں قائم کیں وہاں انہوں نے سب سے پہلے بستی کے مرکز میں مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ سب کچھ قرآن و حدیث کی تعلیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کا نمونہ تھا کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات کا مرکز مسجد بن گئی۔ چنانچہ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب عتبہ بن غزوان نے بصرہ فتح کیا تو سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی اور اس کے پاس ہی دار الامارۃ بنایا اور اس کے ارد گرد پلاننگ کرکے ہر قبیلے کو علیحدہ پلاٹ دیئے اور ہر ایک کے محلے میں مسجد اور قبرستان کی جگہ متعین کی۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ۱۷ھ میں کوفہ فتح کیا تو سب سے پہلے جامع مسجد کی بنیاد رکھی اور اس کے آگے سنگ مرمر کے ستونوں پر سایہ کے لیے ایک چھتری بنائی۔ یہ مسجد شہر کے وسط میں تھی۔ اس مسجد میں چالیس ہزار افراد کے نماز ادا کرنے کی گنجائش تھی۔ اس سے دو سو ہاتھ دور دار الامارۃ بنایا۔ پھر ان کے چاروں طرف مکانات اور گھر تعمیر کرائے۔ مسجد اور دار الامارۃ سے ہر طرف راستے نکلتے تھے، دار الامارۃ اور مسجد عام طور پر برابر برابر تعمیر ہوتے تھے جیسا کہ الفسطاط، دمشق، بصرہ اور قاہرہ وغیرہ میں ہوا۔ نیز خلیفہ عبد الملک نے مسجد کو محل کے

سامنے تعمیر کروایا۔اس لیے کہ مسلمان حکمران مساجد کی تعمیر کو اپنی دینی اور سماجی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اس لیے بھی کہ ابتداء میں امام مسجد اور ملک کا حاکم ایک ہی ہوتا تھا۔ اس طرح ابو عبیدہ بن جراح نے جامع مسجد دمشق اور دار الامارہ کی بنیاد رکھتے وقت کیا تھا۔ بالکل یہی طریقہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے دریائے نیل کے کنارے فسطاط میں بڑی مسجد کی بنیاد رکھتے وقت اختیار کیا۔ عقبہ بن نافع (م ۵۸ھ) نے قیروان کی تعمیر کے وقت مسجد اور دار الامارۃ سے ابتدا کی اور ان کے ارد گرد لوگوں کی رہائش کے خطے متعین کیے تاکہ یہ شہر کا مرکز رہیں۔

مسجد نبوی کا نظام اور معاشرے میں کردار:

سب سے پہلے مسجد نبوی کو لیتے ہیں جو ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے کثیر المقاصد مرکز کی حیثیت رکھتی تھی اور عام معاشرتی زندگی کے کام سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اسلام کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے باعث امت مسلمہ کا سیاسی و مذہبی مرکز بھی تھا۔ لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انفرادی و اجتماعی معاملات کا مرکز مسجد کو بنایا۔ ازواج مطہرات کے حجرے مسجد کے بالکل متصل تعمیر کرائے اور ان میں بعض حجروں کے دروازے مسجد میں رکھے تاکہ مسجد سے براہ راست تعلق رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست مسجد میں ہوتی تھی اور وفود مسجد میں ٹھہرتے اور ملاقات کرتے، ذکر و تعلیم کے حلقے مسجد میں قائم ہوتے، وعظ و نصیحت مسجد میں ہوتی، جہادی زخمیوں کو مسجد میں ٹھہرایا جاتا اور ان کی مرہم پٹی مسجد میں کی جاتی، اصحابہ صفہ کا ٹھکانا یعنی مدرسہ صفہ مسجد کے ایک کونے میں تھا۔ اموال غنیمت اور صدقات واجبہ و نافلہ مسجد میں جمع کئے جاتے اور یہیں سے تقسیم کئے جاتے، صحابہؓ کی مجلسیں مسجد میں ہوتیں، اسلام کی حمایت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اشعار مسجد کے منبر سے پڑھے جاتے، بنو ثقیف کے نمائندوں کے خیمے مسجد میں لگائے گئے، احد کی جنگ کے بعد آنے والی رات سرداروں نے مسجد میں بسر کی۔ جہاد کی تیاری کے لیے اجتماع مسجد میں ہوتا، فقراء اور مساکین کے لیے چندہ مسجد میں کیا جاتا، بعض

جہادی مظاہرے اور کھیل مسجد کے صحن میں کھیلے گئے، مسجد میں تحائف وصول کیے جاتے اور تقسیم کیے جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپسی پر مسجد میں حاضر ہو کر دو رکعت نفل پڑھتے پھر گھر تشریف لے جاتے۔ قیدیوں کو مسجد کے ستون سے باندھا گیا اور فیصلے مسجد میں کیے جاتے۔ الغرض مسجد نبوی دار الندوہ (اجتماعی مشورہ کا مرکز) دار الامارہ (حکومتی مرکز) اور دار التعلیم دار الکفالہ دار الافتاء والقضاء، دار العبادۃ والاصلاح سب ہی کچھ تھی۔

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ وہ تھا جس میں عبادات و تعلیم وغیرہ ہوتی تھی اور دوسرا حصہ وہ تھا جس جہادی مظاہروں، اونٹ باندھنے، مہمانوں کو ٹھہرانے اور خیمے وغیرہ نصب کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کوئی اہم مالی معاملہ پیش آتا اور نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے بعد اور اگر نماز کا وقت نہ ہوتا تو اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ کا اعلان کر کے لوگوں کو جمع فرماتے اور وہ معاملہ ان کے سامنے رکھتے۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دوپہر کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ کچھ لوگ آئے جو ننگے بدن، کمبل یا عبا لپیٹے ہوئے اور گلے میں تلواریں لٹکائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ مضر قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے فقر و فاقہ کی حالت دیکھ کر سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔ آپ گھر میں تشریف لے گئے پھر باہر نکلے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آذان دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ بلال رضی اللہ عنہ نے آذان دی پھر اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی۔ بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین سے خطاب فرمایا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر شخص اپنے دینار و درہم، کپڑے، گندم اور جو کی مقدار میں سے صدقہ و خیرات کرے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ (خیرات کرو) چاہے کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔

راوی کہتا ہے کہ انصار کا ایک آدمی تھیلا لایا جس کے وزن سے اس کے ہاتھ تھک گئے

تھے پھر لوگ پے درپے آنے لگے یہاں تک کہ میں نے کھانے کی چیزوں اور کپڑے کے ڈھیر دیکھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ ایسے چمکتا ہوا دیکھا جیسے سونا ہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ نکالا اس کے لیے اس کا اجر ہے اور ان لوگوں کا ثواب بھی ہے جنہوں نے اس پر عمل کیا۔ لیکن ان لوگوں کے اجر میں سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔ اور جس شخص نے اسلام میں بری مثال قائم کی اور بری بنیاد ڈالی تو اس پر اس کا گناہ ہے اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے گناہ بھی اسے ملیں گے اور ان لوگوں کے گناہوں میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔

اس طرح کے سینکڑوں واقعات ہیں کہ آپ نے اجتماعی مالی معاملات مسجد میں طے کئے۔ مسجد کو ابتدا ہی سے مالی معاملات کے مختلف پہلوؤں کے لیے استعمال کیا گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مساکین کی امداد کے لیے چندے کا اعلان مسجد میں فرماتے اور اس اپیل پر جو مال واسباب جمع ہوتا اسے مسجد میں ڈھیر کرتے اور پھر تقسیم فرماتے۔ زکوۃ کا مال مسجد میں جمع ہوتا اور مسجد ہی سے تقسیم ہوتا اسے مسجد میں ڈھیر کرتے اور پھر تقسیم فرماتے۔ زکوۃ کا مال مسجد میں جمع ہوتا اور مسجد ہی سے تقسیم کیا جاتا۔ صدقہ فطر مسجد میں جمع ہوتا اور وہیں سے تقسیم ہوتا تھا۔

جہاد اور حج وعمرے کا اعلان مسجد میں ہوتا اور جہاد کے لیے سامان مسجد میں جمع ہوتا اور مجاہدین کو دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات مال غنیمت، انفال اور فدیے کا مال بھی مسجد میں لایا جاتا اور یہیں حق داروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اگر مال ایک دن میں تقسیم نہ ہوتا تو آپ ﷺ اس رات گھر تشریف نہیں لے جاتے تھے، بلکہ مسجد میں ہی قیام فرماتے تھے۔ آپ کی اسی سنت کو پیروی کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ نے بھی اجتماعی مالی معاملات کو مسجد میں طے کیا۔ کئی علاقوں میں بیت المال مسجد کے ایک حصے میں رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسامہ بن زید نے ۹۷ تا ۹۹ میں مسجد عمرو کے سامنے ایک قبہ تعمیر کرایا جس میں ایک قبے کا نام ہی قبۃ الخزانہ تھا۔

مسجد کا تعلیم وتدریس کے لیے استعمال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مدنی دور سے شروع ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو مسجد میں صفہ نام کا مدرسہ قائم کیا جس میں طلبہ کی تعداد ستر سے لے کر پانچ سو تک ہوتی تھی۔ جن کے طعام و قیام کا بندوبست مسجد میں ہوتا تھا اور درس وتدریس مسجد میں ہوتا تھا، قرآن مجید میں اور حدیث شریف اور روزہ کے مسائل کی تعلیم ذکر و ارشاد سب کچھ مسجد میں ہوتا تھا۔ اصحاب صفہ تعلیم حاصل کرتے رہتے اور جب کہیں تبلیغ کے لیے مبلغین بھیجنے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ہی ضرورت کے افراد بھیج دیتے تھے۔ نیز مدینے اور ارد گرد کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین وقتاً فوقتاً مسجد میں قیام کرتے اور دین کی تعلیم پاتے تھے۔ لہٰذا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم طالب علموں کی قیام گاہ بھی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف علاقوں میں جو قراء بھیجے تھے، انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ جمعہ کے دن مسجد میں لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ مساجد میں ابتداً قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی پھر حدیث کی تعلیم دی جانے لگی۔ بعد میں دیگر علوم مثلاً فقہ، صرف و نحو منطق وغیرہ کی تعلیم شروع ہوئی اور بعض فنون کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔

اسلام جس سیاست کا علمبردار ہے۔ اس کی بنیاد اللہ کی حاکمیت، طاغوت سے برات اور مخلوق کی کفالت پر ہے۔ اس کی فکری اور نظریاتی بنیادیں قرآن مجید فراہم کرتا ہے اور اس کی عملی تشکیل سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور آپ کی سنت سے ہوتی ہے اور مسجد سے اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسلام زندگی کو ایک کل اور اس کے تمام مسائل کو باہمی مربوط منظّم دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کی نظر میں مسجد صرف ایک عبادت خانہ ہی نہیں اکیڈمی (تعلیم گاہ) اور پارلیمنٹ و مجلس شوریٰ بھی ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس شوریٰ کا اجلاس وہیں ہوتا ہے، وہاں مجاہدین اسلام جنگی مشقیں کر رہے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس معائنہ فرمار ہے ہیں۔

مسجد کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق:

مسجد کی حیثیت، اہمیت اور اجتماعیت میں اس کا مقام و کردار جس کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے، اسے مد نظر رکھتے ہوئے کہ ہمارا مسجد سے تعلق کیا ہو، کیسا ہو اور کس طرح ہو؟ اس کے لیے ایک خاکہ دیا جا رہا ہے، جسے ہم اپنائیں تو ایک طرف مسجد کا حق ادا ہو سکتا ہے، تو دوسری طرف ہماری اجتماعی و معاشرتی زندگی میں جو خامیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ دور ہو سکتی ہیں اور معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی بن سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرح ہر مسلمان کا مسجد سے گہرا تعلق ہونا چاہیے۔ یہ تعلق اتنا مضبوط ہو کہ وہ نہ صرف پنج وقتہ فرض نماز مسجد میں جا کر ادا کرے، بلکہ اکثر اوقات سنت اور نوافل مسجد میں پڑھے نماز سے کچھ وقت پہلے جا کر مسجد میں بیٹھے، تلاوت قرآن مجید اور ذکر کرے، مسنون اوراد وظائف پڑھے۔

حدیث میں آیا ہے کہ: اِنْتِظَارُ الصَّلٰوةِ مِنَ الصَّلٰوةِ [حدیث]

"نماز کا انتظار کرنا نماز میں سے ہے"۔

یعنی جب تک آدمی نماز کے انتظار میں رہے، ثواب ملتا رہتا ہے، مومن کا مسجد سے صرف نماز کا تعلق نہ ہو، بلکہ اپنے لیے دنیا میں بہترین جگہ مسجد ہی کو سمجھے اور اس سے دلی لگاؤ رکھے۔ اگر مسجد میں اعتکاف کی حیثیت سے بیٹھے تو اسے اعتکاف کا ثواب ملے گا۔ شریعت نے مسجد کے تعلق کی اس لیے تاکید کی ہے کہ بندہ جب تک مسجد میں بیٹا رہتا ہے بہت سی برائیوں اور گناہوں سے بچا رہتا ہے۔

مسلمانوں کا پہلے دن ہی سے مسجد کے ساتھ روحانیت و عبادت کا تعلق رہا ہے۔ مسجد میں باجماعت اور انفرادی نماز پڑھنے، تلاوت کرنے، نوافل پڑھنے، ذکر و اذکار کرنے، اعتکاف میں بیٹھنے کو مسلمانوں نے اپنا معمول بنائے رکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد عبادت کا مرکز تو تھا، لیکن ساتھ میں بعض اجتماعی کام بھی مسجد میں کیے جاتے رہے۔

خلفائے راشدینؓ مسجد میں ہی بیٹھتے اور عبادت کرتے تھے اور ان کے چیدہ چیدہ ماتحت حکمران مسجد میں پنج وقتہ نماز کے لیے حاضر ہوتے تھے اس لیے کہ عام مسلمان اپنی عبادات مسجد میں ادا کرتے تھے۔ سفر سے لوٹنے پر نوافل ادا کرنے کے لیے بھی لوگ مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ مصر میں بعض راتوں کو مسجدوں میں بہت رونق ہوتی تھی۔ لوگ اجتماعی کھانا کھاتے اور پوری رات مسجد میں قیام کرتے تھے۔ یہ سلسلہ جزوی طور پر آج بھی جاری ہے کہ بعض جگہ رجحان میں روزانہ اور بطور خاص جمعرات کو مساجد میں کھانا جمع ہوتا ہے جو مستحق مسافروں اور روزہ داروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ بعض لوگ شادی یا خوشی کے دوسرے موقع پر اور بعض اوقات مصیبت اور تکالیف کے مواقع پر مسجد کے لیے صدقہ و خیرات دیتے ہیں۔ آفات و مصائب میں مسجد میں جمع ہو کر دعا مانگتے ہیں۔ بعض لوگ خوشبو اور تیل یا دوسری اشیاء بطور ہدیہ بھیجتے ہیں۔ یہ سلسلہ مسلمانوں کا مسجد سے لگاؤ کی علامت ہے، لیکن مسجد کو آباد کرنے والے عوامل میں سے یہ صرف ایک عامل ہے۔

مسجد سے تعلق کی ایک صورت یہ ہے کہ مسجد کی خدمت کرے، مسجد کے خادموں کے کام کاج ہمیں ہاتھ بٹائے۔ صفائی و انتظام میں ان کی مدد کرے، لوگوں کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بتائے۔ مسجد میں درس قرآن کا اہتمام کرے، کوئی دینی کتاب پڑھ کر سنائے۔ یا خود دین کا علم حاصل کرے۔ یہ سب کام سنت کے مطابق ہیں۔

ہر مسلمان کو چاہیے کہ جس محلّہ یا بستی میں مسجد نہیں ہے، وہاں دوسرے بھائیوں سے مل کر مسجد تعمیر کرے اور جہاں مسجد ہے اسے اچھی حالت میں رکھے اور آباد کرنے کی کوشش کرے۔ اپنی حلال آمدنی میں سے کچھ حصہ مسجد کے لیے مختص کرے اور مسجد میں وہی کام اور نظام چلانے کی حتی الوسع کوشش کریں، جس طرح مسجد نبوی میں ہوا کرتا تھا۔ تو یقینا مسجد ہمارے معاشرے کی تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے جو کہ ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے۔

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں نے ایک عرصہ تک مسجد کو اپنا روحانی عباداتی، تعلیمی، تدریسی، تربیتی، سماجی، فلاحی، سیاسی اور اجتماعی مرکز بنائے رکھا۔ جب تک مسجد کی یہ حیثیت بر قرار رہی مسلمانوں میں اجتماعیت، مساوات، یک جہتی، محبت، اخوت، یگانگت اور سیاسی و معاشرتی اتحاد قائم رہا، لیکن جب مسلمانوں نے مسجد کی اس حیثیت کو پس پشت ڈال دیا تو ان میں طرح طرح کے فتنے پھیل گئے اور وہ تفرقے میں پڑ گئے۔

تاریخِ اسلام صاف صاف بتاتی ہے کہ قرن اول اور بعد کے ادوار میں کچھ عرصہ تک مسلمانوں نے مسجد کے حقیقی مقام اور کام کو ملحوظ رکھا اور اسے اپنا اجتماعی مرکز بنایا۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کو جو حیثیت دی ہے اس کے عین مطابق انہوں نے جب تک اس کے ساتھ اپنا تعلق جوڑے رکھا، تو معاشرہ مستحکم اور مستقیم رہا، لیکن افسوس جب یہ تعلق کمزور ہوا تو اجتماعی زندگی کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔

دور نبوی کا نظام مواخات

اسلام کی نظر میں تمام مؤمنین رشتہ اخوت میں جڑے ہوئے ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے :

"تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں"۔ [الحجرات : ۴۹:۱۰]

اسی رشتے کی بناء پر اسلام تمام اہل ایمان پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گہرے برادرانہ تعلقات قائم کریں اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون بنیں۔ اس مضمون کا خصوصی موضوع وہ نظام مواخات ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جو تین کام کئے، ان میں سے ایک ہے یعنی اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان اخوت قائم کیا تھا۔ اس نظام کے ذریعے ان کے مابین وہ مخصوص حقوق و فرائض وجود میں آئے تھے، جو عام اہل ایمان کے آپس کے حقوق و فرائض سے بڑھ کر ایک ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

مکہ میں مواخات کا قیام:

مشہور مورخ اور جغرافیہ دان بلاذری لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے ہی مکے میں مسلمانوں کے درمیان اس بنیاد پر نظام مواخات قائم فرمادیا تھا کہ وہ حق کی پاسداری کے لیے ایک دوسرے کے مدد و معاون بن کر رہیں گے، چنانچہ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان مکے میں مواخات قائم کر دی گئی تھی، ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

۲۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ

۳۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

۴۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

۵۔ حضرت عبیداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ

۶۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

۷۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ

۸۔ حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبیداللہ

۸۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رشتہ مواخات مستحکم فرمایا۔

مدینہ میں قیام مواخات اور اس کی وجوہات:

مکے سے جن لوگوں نے مدینے ہجرت کی، انہیں مختلف معاشی، معاشرتی اور صحت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات تو سب لوگ جانتے ہیں کہ مہاجرین اپنے اہل و عیال اور اپنا بیشتر مال و دولت مکے ہی میں چھوڑ کر آگئے تھے۔ یہ لوگ تجارت میں تو مہارت رکھتے تھے جو قریش کا خاص امتیازی وصف تھا، لیکن زراعت اور صنعت کے شعبوں سے یہ حضرات قطعاً ناآشنا تھے، جبکہ مدینے کا معاشی نظام تمام کا تمام زراعت اور صنعت پر ہی قائم تھا۔

تجارت کے لیے چونکہ سرمایہ درکار ہوتا ہے، اس لیے مہاجرین فوری طور پر ایک نئے معاشرے میں اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ مدینے کی نوزائیدہ ریاست بے شمار مسائل سے دوچار تھی جن میں سر فہرست مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا۔ مہاجرین اس علاقے میں نووارد اور اس معاشرے سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔ وہ اپنے اہل و عیال اور تمام احباب کو مکے میں چھوڑ آئے تھے جن کے ساتھ اب ان کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ مدینے میں شدید قسم کی تنہائی کا شکار تھے اور اپنی سرزمین کی یاد سے بھی بیگانہ نہیں تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ نئے شہر کی آب و ہوا بھی ان کے پرانے وطن سے مختلف تھی جس کی وجہ سے کچھ مہاجرین بخاری میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں فوری توجہ کی ضرورت تھی اور ایسا عارضی حل چاہیے

تھا جو میزبانی کی عمومی رسوم ہی تک محدود نہ ہو۔ انصار مدینہ نے مہاجرین کی مدد کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ انہوں نے ایثار اور خلوص کی وہ اعلیٰ مثالیں قائم کیں جو کتاب اللہ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینے کی مستحق قرار پائیں۔

انصارِ مدینہ نے سخاوت اور فیاضی کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنے تمام نخلستان اپنے اور اپنے مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم کرلیں گے، کیوں کہ یہ نخلستان آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ان نخلستانوں کا انتظام اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں، لیکن ان کا جو پھل اترے، اس میں اپنے مہاجر بھائیوں کو بھی شریک کرلیا کریں۔

مواخات اور انصار کا ایثار:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں چاہتے تھے کہ مہاجرین زراعت کے کاموں میں حصہ لیں۔ اس کی دو وجوہ تھیں، ایک وجہ تو یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مہاجرین سے جہاد اور تبلیغ کا کام لینا چاہتے تھے، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مہاجرین زراعت سے مکمل طور پر نابلد تھے جس کا اظہار بھی ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اسی وجہ سے مدینے کی زرعی پیداوار میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

اسی طرح انصار نے اپنی تمام اضافی اراضی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو ہمارے مکانات بھی آپ کے لیے حاضر ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنے مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے لیے اس زمین پر کچھ مکانات تعمیر کرائے، جو انصار نے پیش کی تھی اور کچھ اس زمین پر جو کسی کی ملکیت نہیں تھی۔

انصار کے اس فیاضانہ برتاؤ نے مہاجرین کے دل موہ لیے۔ وہ انصار کی سخاوت اور فیاضی کا برملا اعتراف کیا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مہاجرین

نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! ہم نے انصار جیسے لوگ کبھی نہیں دیکھے، وہ بہترین لوگ ہیں۔ اگر ان کے پاس تھوڑا ہے، تب بھی وہ مدد کرنے سے نہیں چوکتے اور اگر ان کے پاس زیادہ ہو، تب بھی ایثار میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔ انہوں نے ہر ضرورت میں بڑھ چڑھ کر ہماری مدد کی ہے، یہاں تک کہ اپنی خوشیوں میں ہمیں اس حد تک شریک کیا ہے کہ ہمیں لگتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں سے تمام تر اجر و ثواب کے مستحق وہی قرار پائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: نہیں! بلکہ جب تک تم ان کی تعریف و توصیف کرتے رہو گے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو گے (یعنی تم بھی ثواب کے مستحق گردانے جاؤ گے)۔

مہاجرین کے لیے انصار کے تمام تر مالی ایثار اور فیاضی کے باوجود ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے، جس میں مہاجرین کو قانونی طور پر ایک باعزت مقام حاصل ہو جائے۔ بالخصوص مہاجرین کا مرتبہ اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ ان کے مسائل کو اس طرح حل کیا جائے کہ وہ خود کو انصار کے اوپر بوجھ محسوس نہ کریں۔ بنابریں مواخات کے نظام کو ایک قانونی حیثیت دے دی گئی۔ مواخات کو قانونی حیثیت دینے کی تاریخ کے متعلق جتنی روایات ہم تک پہنچی ہیں، ان میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم تمام راوی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قانون سازی ہجرت کے پہلے برس ہی عمل میں آگئی تھی۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا یہ قانون مسجد نبوی کی تعمیر کے دوران میں نافذ کیا گیا یا اس کے بعد۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے خیال میں ہجرت کے پانچویں مہینے کی کسی تاریخ کو مواخات کے نظام کو قانونی شکل دی گئی، جبکہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ہجرت کے بعد اور جنگ بدر سے پہلے یہ کام ہوا، تاہم وہ بھی کسی خاص تاریخ کا تعین نہیں کرتے۔

روایات میں آتا ہے کہ اس قانون کا باقاعدہ اعلان حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے گھر پر کیا گیا۔ یہ مواخات انصار اور مہاجرین کے درمیان کرائی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے دو دو بھائیوں کی جوڑیاں تشکیل دے دیں، جن میں سے ایک کا تعلق انصار سے اور دوسرے کا مہاجرین سے تھا۔ مواخات ۹۰ اشخاص کے ما بین کرائی گئ جن میں سے ۴۵ افراد مہاجرین میں سے اور ۴۵ انصار میں سے تھے۔ روایات میں آیا ہے کہ کوئی مہاجر ایسا نہیں بچا تھا جس کا بھائی چارہ کسی انصاری سے قائم نہ کر دیا گیا ہو۔ تاریخ اسلام اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام قدیم مآخذ اس پر متفق ہیں کہ مواخات مہاجرین اور انصار کے درمیان کرائی گئ تھی۔

مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کے قیام کے لیے جو قانون بنایا گیا، اس کے نتیجے میں باہم بھائی بننے والے دو اشخاص کو ایک دوسرے کے اوپر خاص حقوق حاصل ہو گئے تھے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ وہ باہم معاونت کیا کریں گے، اور یہ باہمی معاونت کسی خاص معاملے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ زندگی کے تمام مسائل پر محیط تھی۔ خواہ وہ مادی مسائل ہوں یا روحانی۔ ایک دوسرے کی مدد اور دیکھ بھال سے لے کر باہمی محبت اور دوستانہ روابط تک اس تعاون کے دائرے میں شامل تھے، یہاں تک کہ مواخات کے نظام میں یہ امر بھی شامل تھا کہ دو افراد جو آپس میں بھائی قرار دیے گئے ہیں، قطع نظر دیگر رشتہ داروں کے، وہ ایک دوسرے کی وراثت کے بھی حقدار ہوں گے۔ ان تمام حقوق نے مواخات کے رشتے کو اتنا گہرا اور اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ خونی اور نسلی تعلق بھی اس کے آگے ماند پڑ گیا تھا۔

انصار اس بات پر خوش تھے کہ انہیں اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کرنے اور ان کے لیے قربانی دینے کا موقع ملا۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انصار نے دل کی گہرائیوں سے مواخات کی پاسداری کی اور اس پر عمل درآمد کرنے میں اپنے انتہائی جذبات کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک منفرد اور یگانہ روزگار مثال حضرت سعد بن ربیع (انصاری) رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (مہاجر) رضی اللہ عنہ کی ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پورے جذبہ اخوت کیساتھ اپنے مواخاتی بھائی عبدالرحمٰن سے کہا: میرے پاس جتنی دولت ہے، میں اسے اپنے اور تمہارے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر لوں گا۔ میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جس کے

ساتھ بھی تم نکاح کرنا چاہو، میں اسے طلاق دینے کے لیے تیار ہوں، تم مقررہ میعاد گزرنے کے بعد اس سے شادی کر لینا۔ حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اسی جذبے کیساتھ جواب دیا: اللہ تمہارے مال اور تمہاری بیویوں کو تمہارے لیے باعث برکت بنائے، مجھے بازار کا رستہ دکھا دو۔ جب حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ بازار سے لوٹے تو ان کے پاس مکھن اور پنیر تھا جو انہوں نے اپنی تجارت میں نفع کے طور پر کمایا تھا۔ حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے چہرے پر زرد رنگ کی خوشبو کے آثار دیکھے تو پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ عبد الرحمٰن میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے انصار کی ایک خاتون سے شادی کر لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تو ولیمے کا اہتمام کرو، چاہے ایک بکری ہی ذبح کر لو۔

بلاشبہ اس بے مثال اخوت اور باہمی خلوص کی تصویر دیکھ کر انسان حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے، جس کی مثال پوری تاریخ انسانی میں دنیا کی کسی قوم نے پیش نہیں کی۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا شریفانہ اور غیرت مندانہ رویہ اور اپنے مواخاتی بھائی سے فائدہ نہ اٹھانے کا جذبہ بھی اسی قدر قابل تحسین ہے جس قدر ابن ربیع رضی اللہ عنہ کی فیاضی اور ایثار قابل قدر ہے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک لائق اور تجربہ کار تاجر تھے اور اپنی نئی اجتماعی زندگی میں اپنا مقام خود پیدا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد ان کی مالی حالت اس قدر مستحکم ہو گئی تھی کہ انہوں نے نہ صرف شادی کر لی، بلکہ سونے کی کچھ مقدار بھی اپنی اہلیہ کو مہر کے طور پر ادا کی، اور پھر ایک وقت آیا کہ ان کے کاروبار میں بہت برکت پیدا ہوئی اور ان کے مال میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا کہ ان کا شمار مسلمانوں کے دولت مند ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ عسرت کے دنوں میں بھی انہوں نے مانگنے سے ہمیشہ اجتناب کیا اور اپنے ہاتھ کو اوپر والا ہاتھ ہی بنائے رکھا جو دینے پر تو آمادہ رہتا ہے، مگر لیتا کبھی نہیں۔

آخر میں حتمی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان جو نظام مواخات قائم کیا گیا تھا اور اسے قانونی حیثیت دی گئی تھی وہ ہمیشہ نا قابل تنسیخ رہے گا، البتہ اس نظام میں سے وراثتی حقوق منہا کرکے منسوخ کر دیئے گئے تھے۔ ہر زمانے میں مسلمان اس نظام کو اپنے ہاں قائم کر سکتے ہیں۔اس کی بنیاد باہمی تعاون، ہمدردی، اور مشاورت پر ہو گی اور اس کے نتیجے میں چند ایسے مخصوص حقوق ایک دوسرے پر عائد ہونگے جو عام اخوت اسلامی کے حقوق سے بڑھ کر ہونگے۔

مسلمانوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کا مکمل مظاہرہ اسی طرح ہو سکتا ہے، جب وہ ضرورت کے وقت ایمان اور اسلام کے رشتے کو ترجیح اور فوقیت دیتے ہوئے اپنے تمام دیگر معاشرتی، علاقائی اور قومی تعلقات اور تعصّبات کی قربانی دیں۔

ریاست مدینہ کا دستور (میثاق مدینہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ تشریف آوری پر تین کاموں میں سے پہلا کام مسلمانوں کے لیے ایک کثیر المقاصد ادارہ اور ایک دینی مرکز مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر ہوئی جس سے مسلمانوں کو اپنی عبادت تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ معاملات طے پانے کے لیے ایک اپنی بااختیار جگہ مل گئی۔ اسلامی تحریک اور اسلامی ریاست کے قیام میں اس دینی مرکز اور ادارے کی ضرورت اور افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

ہجرت کے بعد اگر مکہ والے مسلمانوں کو نہ چھیڑتے تو وہ آرام سے مدینہ میں اپنی زندگی بسر کرتے رہتے، لیکن انہوں نے مسلمانوں کو مدینہ پر حملہ کرنے کی دھمکیاں دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مسلمانوں یعنی مھاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کیے تاکہ مھاجرین کو شہر مدینہ کے معیشت میں داخل کیا جائے اور ان کے بسر کا انتظام کیا جائے تاکہ ایک تو وہ سوسائٹی پر بوجھ نہ بنے اور دوسرا مھاجرین بھی معاشی مسائل سے دوچار نہ ہو اور وہ اطمینان قلب حاصل کرکے دعوت دین اور اقامت دین کے لیے یک سو ہو جائیں، یہ کام انصار کے فراخ دلی اور مہمان دوستی کے باعث بہت جلد اور آسانی سے ممکن ہوا۔

تیسرا کام میثاق مدینہ کا قیام ہے۔ اسلام سے پہلے مدینہ میں کسی بھی طرح کی کوئی مملکت کا وجود نہیں تھا، بلکہ قبائلی نظام تھا جو آپس کی خانہ جنگی میں مبتلا تھے، ہجرت سے سات آٹھ سال قبل ایک جنگ ان کے درمیان شروع ہوئی تھی، یہ جنگ بعاث کہلاتی تھی جو کئی سال جاری رہی اور اوس وخزرج کے قبائل آپس میں شمشیر آزما ہوئے تھے۔

یہودیوں کے کچھ قبائل نے اوس کا ساتھ دیا اور کچھ قبائل نے خزرج کا ساتھ دیا، کئی سال بعد ہجرت سے تقریباً چار پانچ سال پہلے کہیں جا کر یہ جنگ ختم ہوئی۔ اسی جنگ سے مایوس ہو کر اور اس سے پریشان ہو کر اوس اور خزرج کے بعض لوگوں نے یہ تجویز دے رکھی

کہ ہمیں ایک مشترکہ سربراہ کا انتخاب کرنا چاہیے، چنانچہ کچھ کی رائے اوس کے ابو عامر راہب پر تھی اور بعض لوگوں کی تجویز کے مطابق عبد اللہ بن ابی ابن سلول جو بعد میں رئیس المنافقین کے نام سے مشہور ہوا کو سربراہی کے لیے منتخب کرنے کی تھی۔ سربراہ کے انتخاب پر تاج پوشی کے لیے مدینہ کے یہود سناروں کو تاج بنانے کا آڈر بھی دیا گیا تھا۔اسی اثناء میں ہجرت کا واقعہ پیش آگیا اور جتنے انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین یعنی اوس اور خزرج تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور وہ حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گئی جو بعض لوگوں کے خیال میں عبد اللہ بن ابی ابن سلول کے لیے سوچی جارہی تھی۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تیسرے کام یعنی قیام ریاست اور میثاق مدینہ کے کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مدینہ شہر اور ارد گرد کے تمام عناصر اور قبائل کا ایک بہت بڑا جلسہ اور مشترکہ اجلاس بلایا جس میں مسلمان، مھاجر، انصار، مسلم و غیر مسلم، مدینہ کے مشرک جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے یہود، عیسائی سب شریک ہوئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشترکہ حکومت قائم کرنے کی رائے پیش کی۔ تمام شرکاء نے اس رائے کو اکثریت کے ساتھ قبول کیا سوائے چند خاندانوں کے جن میں سے ایک عبد اللہ بن ابی ابن سلول اور ان کے کچھ ساتھی تھے، کیونکہ اُس کی متوقع حیثیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منتقل ہونا تھی اور دوسرا ابو عامر راہب اور اس کے خاندان کے لوگ کیونکہ وہ انجیل کا عالم تھا اور اس نے انجیل میں پڑھا تھا کہ آخری نبی آئے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف آوری پر وہ رنجیدہ ہوا کہ نبی تو مجھے ہونا چاہیے تھا، کیونکہ میں عالم ہوں اور یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم توامی ہے وغیرہ۔

الغرض اکثریت کی اتفاق رائے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے کئی نکات پر مشتمل دستور پیش کیا جس کو میثاق مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس دستور کی چند اہم باتیں یہ تھی۔

پہلی دفعہ حکمران اور رعایا کے حقوق کو تحریری طور پر عمل میں لایا گیا۔ دستور مرتب کر کے پھر تمام لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا یہاں خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ہے جو ایک اُمی شخص کے ہاتھوں وجود میں آئی۔

میثاق و دستور مدینہ کے دفعات:

۱۔ یہ مملکت ساری دنیا کے مقابل میں ایک مستقل خود مختار مملکت ہو گی۔

۲۔ اس مملکت میں مسلمان بھی ہونگے اور غیر مسلم بھی ہونگے۔

۳۔ غیر مسلموں کو ان کے دین کی پوری آزادی ہو گی۔ لِلْمُسْلِمِیْنَ دِیْنُھُمْ وَلِلْیُھُوْدِ دِیْنُھُم۔

۴۔ مملکت کے سربراہ کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بالاتفاق مقرر کیا گیا۔ چند مہینوں میں آپ کی فیاضی عقلمندی، عدل پسندی لوگوں کو معلوم ہوئی۔

اس دستور میں دفاع کے سلسلے میں دو باتیں اہم اور قابل ذکر ہیں۔

۵۔ امن اور جنگ نا قابل تقسیم چیزیں ہیں، اگر امن ہو تو تمام مدینہ والوں اور تمام قبائلوں کے لیے اور اگر جنگ ہو تو بھی تمام کا۔ ایسا نہیں کہ چند قبائل لڑتے رہے اور چند کا صلح ہو۔ امن اور جنگ کی مرکزیت اور نا قابل تقسیم ہونا ایک اہم چیز تھی۔

۶۔ اگر جنگ کے لیے باہر جانا پڑے تو اس میں کون شریک ہوں اور کون شریک نہ ہوں، یہ اختیار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گا، گویا کہ آپ کا اختیار کمانڈر ان چیف سے بھی زیادہ تھا کہ نہ صرف آپ جنگی انتظام کریں گے، بلکہ جنگ کے سیاسی پہلو پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار ہو گا کہ اُن لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خارج کر سکتے ہیں کہ جو مشتبہ ہو اور جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہے۔

۷۔ یہ بھی صراحت ہے کہ اگر باہر سے کوئی حملہ آور ہوں تو ہر محلّہ، قبیلہ مدافعت براہ راست کریں گے اور اس میں تمام محلے اور قبائل ایک دوسرے کا تعاون کریں گے۔

۸۔ فوج کے اخراجات ہر محلّہ اور قبیلہ خود برداشت کرے گا، کیونکہ اس وقت حکومت

ابتدائی تھی اور حکومت کے پاس مال اور بیت المال نہ تھا یعنی رضاکارانہ فوج تھی۔ اسلحہ بھی اپنا، خرچہ بھی اپنا، کیونکہ اس سے حکومت پر بوجھ نہیں پڑے گا، لیکن پھر بھی فوج کی مرکزی بھاگ دوڑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی۔ یہ پہلی سن ہجری کا واقعہ تھا۔

۹۔ عدل اور فیصلوں کا انتظام عدالت ابتدائی قبیلہ وار ہو گی یعنی ہر قبیلہ اپنا مسئلہ اپنے قبیلے کے سردار کے پاس لائے گا۔ اگر مسئلہ دو مختلف فریقوں کے درمیان ہو تو اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں یا اپنا کوئی اور حکم مقرر کر لیں، لیکن یہ صراحت ہے کہ آخر میں عدالت اپیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہو گی۔

۱۰۔ دستور میں مسلمانوں کے لیے یہ صراحت ہے کہ قانون ساز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو نگے، یعنی قومی انتظام اور عدالت عظمیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں تھے۔ مطلب یہ کہ مسلمان صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت پر فیصلہ کریں گے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مدینہ تشریف لانے کے بعد تیسرا کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کہ ایک چارٹر مرتب فرمایا جس کو بعض مورخین نے میثاق مدینہ کا نام دیا ہے۔ بعض نے اس کو معاہدہ کہا ہے۔ اس کے قدیم ترین راویان مثلاً امام ابو داؤد، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور سیرت نگاروں میں ابن ہشام اور ابن سعد اور مورخین میں کئی افراد نے اس کے لیے کتاب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

كِتَابُ رَسُولِ اللهِ صَلى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ لِلانْصَارِ وَالمُهَاجِرِينَ يَا بَيْنَ الانْصَارِ وَالمُهَاجِرِين

کتاب کا عربی ترجمہ فیصلہ یا چارٹر ہوتا ہے۔ یہ چارٹر یا فیصلہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، یقیناً اس چارٹر کو جاری کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل سے بات کی۔ اور چارٹر کی تفصیلات ان کے مشورہ سے طے کیں۔ جب انصار کے ذمہ داروں

سے ابتدائی گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی گھر میں ہوئی تھی۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے جب یہ معاہدہ ہو رہا تھا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ حضور ایک ایک جملہ املا فرماتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا۔ میرا گھٹنا حضور کے گھٹنے کے نیچے تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھے ہوئے تھے جب یہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا۔

اس کے بعد جب یہ معاہدہ مکمل ہو گیا۔ عام طور پر قدیم و جدید مورخین کا کہنا یہ ہے کہ یہ معاہدہ ۴۷ یا ۵۲ دفعات پر مشتمل تھا اور ان دفعات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ معاہدہ دو الگ الگ اوقات میں کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک ہی معاہدہ ہے اور ایک ہی وقت میں کیا گیا ہے۔ جدید مصنفین میں سے مثلاً ڈاکٹر حمید اللہ صاحب رحمہ اللہ اور کئی اور حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ دو الگ الگ دستاویزات تھیں جو دو مختلف اوقات میں مرتب ہوئیں اور بعد میں ان کو املا کرکے ایک کر دیا گیا۔ پہلے پچیس دفعات تو ہجرت کے بالکل ابتدائی دنوں میں مرتب ہوئیں اور یہ مہاجرین اور انصار کے مختلف قبائل کے درمیان طے پانے والا معاہدہ تھا۔ دوسرا حصہ غزوہ بدر کے بعد مرتب ہوا۔ اس کے رو سے یہودی قبائل بھی اس معاہدہ میں شامل ہوئے۔ عربی زبان کی مشہور لغت لسان العرب میں ایک جگہ دو کتابوں کا حوالہ ہے۔

کِتَابُہُ صَلی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ لِمُھَاجِرِینَ وَالانْصَارِ اور کِتَابُہُ صَلی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ لِلْیَھُوْدِ

اس سے پتہ چلا کہ قدیم مصنفین میں سے ابن منظور افریقی بھی اس کو دو دستاویزات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔

امام ابو داؤد نے بھی اپنی کتاب الخراج و الفی والامارۃ، جو سنن ابو داؤد کا ایک حصہ ہے، اس کے باب نمبر: ۲۱ میں جس کا نام ہے بَابُ کَیْفَ کَانَ اِخْرَاجُ الْیَھُوْدِ مِنَ الْمَدِیْنَہِ الْمُنَوَّرَۃِ کہ یہودیوں کا اخراج مدینہ منور سے کب اور کیسے ہوا۔ اس میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیسے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک کتاب تحریر فرمائی تھی اور یہ کہ غزوہ بدر کے بعد یہودی بھی اس چارٹر میں شامل ہو گئے تھے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ یہ دو الگ الگ معاہدے تھے جو بعد میں ایک دستاویز میں جمع کر دیئے گئے تھے۔ اس کی دفعات ڈاکٹر حمید اللہ نے ۵۲ قرار دی ہیں۔ وینسنک جو مشہور ڈچ مستشرق تھے، انہوں نے ۴۷ دفعات قرار دی ہیں۔ بعض دیگر مصنفین نے ۵۶ دفعات قرار دی ہیں۔

یہ تحریر یا دستاویز مدینہ کی ریاست کے لیے ایک آئینی دستاویز تھی، ڈاکٹر حمید اللہ اور ول ہاوزن اور کئی دوسرے جدید مصنفین نے بجا طور پر اس کو انسانی تاریخ کا پہلا تحریری دستور کہا ہے۔ یقینا یہ انسانی تاریخ کا پہلا تحریری اور مدون دستور ہے۔ اس سے پہلے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے تحریری دستور مرتب کر کے نافذ کیا گیا ہو۔

دستور اور میثاق کے چند مختصر امور ذکر کرنے کے بعد اصل دستور کچھ اس طرح ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

هٰذَا كِتَابٌ مِن مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ صَلى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ بَيۡنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ مِنۡ قُرَيۡشٍ وَيَثۡرِبَ وَمَنۡ تَبِعَهُمۡ فَالۡحَقَ بِهِمۡ وَ جَاهِدَ مَعَهُمۡ اَنَّهُمۡ اُمَّةٌ وَاحِدَةٌ مِن دُوۡنِ النَّاسِ۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ ایک چارٹر ہے جو پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری کیا ہے۔ یہ ان مومنین اور مسلمین کے درمیان ہے۔ جن کا تعلق قریش اور یثرب سے ہے اور ان تمام لوگوں سے جو بعد میں ان کی پیروی کرتے ہوئے ان کے ساتھ آملیں۔ اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں۔ یہاں دو فریقین کا ذکر آگیا کہ یہ وہ پارٹیاں ہیں جن کے درمیان یہ چارٹر جاری کیا گیا۔

یہ چارٹر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سربراہ ریاست دیا ہے۔ پہلی مرتبہ قبائلی نظام میں ایک ریاست قائم ہوئی ہے۔ پہلی مرتبہ ایک ایسی امت قائم ہوئی جو مختلف قبائلی وابستگیوں سے ماورا ہے۔ پہلی مرتبہ ایک دینی عقیدہ کی بنیاد پر ایسی وحدت قائم ہوئی ہے جو

رنگ و نسل سے بالاتر ہے۔ ان دفعات سے یہ باتیں خود بخود سامنے آتی ہے۔

ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک مدینۃ النبی کا نام زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ مدینۃ النبی کا نام اگر عام ہو گیا ہوتا تو شاید یثرب کے بجائے وہی لکھا جاتا۔ بعد کی بعض دستاویزات میں مدینہ کا لفظ شامل ہے۔ جو قبائل اس دستاویز میں شامل ہوئے۔ آگے چل کر ان کی فہرست الگ الگ دفعات میں بیان کی گئی ہے۔ یہودی قبائل ابتدا میں اس معاہدہ میں شامل نہیں تھے۔ خود کئی عرب غیر یہودی قبائل بھی شروع شروع میں اس دستور یا چارٹر میں شامل نہیں تھے۔ اوس کے بہت سے گروپ شروع ہی میں شامل ہو گئے، چار قبائلی گروپ شامل نہیں ہوئے۔ یوں مدینہ کے یہ لوگ غزوہ خیبر کے بعد شامل ہوئے۔ یہ جو بارہ چودہ میل چوڑا علاقہ تھا اس میں جو منتشر گاؤں یا آطام تھیں ان کا بیشتر حصہ اس میں شامل ہو گیا۔ اور جو لوگ شامل نہیں ہوئے ان میں سے کچھ نے اس کی مخالفت کی۔ کچھ نے مخالفت نہیں کی، لیکن بالادستی عملاً سب نے اس کی تسلیم کر لی۔

پہلی دفعہ سے یہ بات بھی واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ معاہدہ بنیادی طور پر قریش کے مسلمانوں اور انصار کے مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ انہی کو امت واحدہ کے نام سے یاد کیا گیا۔ بقیہ لوگ ضمناً اس میں شامل ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی معاہدہ، حلف یا ولاء کے نتیجے میں قریش یا انصار کے ساتھ تھے۔ یا کچھ ایسے غیر قریشی مہاجرین جو مکہ مکرمہ میں آباد تھے اور ان کا تعلق قریش سے نہیں تھا۔ مثلاً حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ، یہ حضرات خود قریشی نہیں تھے، لیکن مختلف قریشی قبائل سے وابستہ تھے۔ وہ سب اس کے تحت شامل ہیں۔

اس کے بعد جو بقیہ دفعات ہیں ان میں بعض غیر مسلم مدنی قبائل کو بھی شامل کیا گیا۔ وہ غیر مسلم جن میں بعد میں پہلے مشرکین اور پھر یہودی بھی شامل ہو گئے۔ یہ بطور شہریان ریاست کے شامل ہوئے اور بطور افراد امت کے شامل نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ ان کے

بارے میں کہا گیا کہ ہم امة مع المومنین۔ ان کو امة من المومنین نہیں کہا گیا بلکہ امة مع المومنین کہا گیا۔

اس معاہدہ کے ابتدائی حصہ کے نفاذ کے بعد غزوہ بدر تک بیشتر یہودی اس میں شریک نہیں رہے۔ کچھ قبائل تو پہلے شامل ہوئے تھے۔ غزوہ بدر کے بعد بقیہ یہودی شامل ہو گئے، البتہ کچھ یہودی قبائل آغاز ہی سے اس میں شامل تھے۔ ان کے بارے میں الگ سے دفعات رکھی گئیں۔

وَاِنَّهُ مَن تَبِعَنَا مِن يهود فَاِنَّ لَهُ النَّصرُ والاسوة غَيرَ مَظلُومِينَ وَلَا مُتَنَاصِرِينَ عَلَيهِم

جو یہودی ہمارے اس معاہدہ میں ہماری پیروی کریں گے ان کو بھی اس طرح سے مدد فراہم کی جائے گی اور ان کو وہی مساوات کا حق دیا جائے گا جو قریش اور انصار کو حاصل ہے۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا، نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔

وَاِنَّ اليَهُودَ يُنفِقُونَ مَعَ المُؤمِنِينَ مَا دَامُوا مُحَارِبِينَ،

یہ جملہ دو مرتبہ آیا ہے۔ اگر یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کے لیے کہا جائے گا تو وہ جنگ کے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ اس لیے کہ ان کا بھی دفاع ہو گا۔ اپنے دفاع کے اخراجات وہ خود برداشت کریں گے اور مسلمان اپنے دفاع کے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ اس سے بھی واضح طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ امت واحدہ کے فرد نہیں تھے۔ اگر امت واحدہ کے فرد ہوتے یا ان کو امت واحدہ میں شامل سمجھا جاتا تو وہ اپنے دفاعی اخراجات کو خود ادا کرنے کے پابند نہ ہوتے۔

اس کے بعد آگے چل کر ایک ایک کر کے یہودی قبائل اس معاہدہ میں شامل ہوتے گئے۔ ان میں سے اکثر کی نشاندہی اس دستاویز کے متن میں کی گئی ہے۔ سات قبائل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان قبائل کو وہ تمام مراعات دی گئیں جو ابتدا میں مسلمانوں کی دی گئی تھیں۔ اس دستاویز میں ایک دفعہ ایسی ہے جو تقریباً ہر قبیلہ کے حوالہ سے دہرائی گئی۔ آٹھ دس مرتبہ اس کو دہرایا گیا ہے۔ وہ ہے:

اَلْمُهَاجِرُوْنَ مِنْ قُرَيْشٍ عَلٰى رُبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُوْنَ بَيْنَهُمْ مُعَاقِلَهُمُ الْاُوْلٰى

یہی بات انصار کے بارے میں بھی ہے کہ وہ اپنے سابقہ طریقہ کار پر کاربند رہیں گے اور دیت کی ادائیگی آپس میں حسب سابق کرتے رہیں گے۔ گویا سوشل سیکورٹی کی ذمہ داری ہر قبیلہ کی اپنی ہوگی اور وہ اس نظام کے بدستور پابند ہوں گے جو ان کے قبیلے میں پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ بات مہاجرین کے ساتھ ساتھ، انصار کے آٹھ اور تمام یہودی قبائل کے بارے صراحت سے کہی گئی اور ان الفاظ کو ایک ایک کرکے دہرایا گیا۔

۲۵ دفعات پر مشتمل پہلے جز کی آخری دفعہ میں یہ تھا کہ:

وَاِنَّكُمْ مَهْمَا اخْتَلَفْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّمَا مَرَدُّهٗ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَاِلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ

اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان کوئی اختلاف ہو جائے تو اس کا آخری فیصلہ اللہ عزوجل اور محمد علیہ الصلوۃ والسلام کریں گے۔ گویا شریعت کی بالادستی اور اختلافی امور یعنی غیر منصوص امور میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات مبارکہ کو تسلیم کرلیا گیا۔ اس میں تمام شہریوں کو مساوات کی یقین دہانی کرائی گئی۔ اس سے پہلے عرب کے ماحول میں مساوات نہیں ہوتی تھی۔ بعض قبائل کا حق زیادہ ہوتا تھا اور بعض کا کم ہوتا تھا۔ یہاں تک تھا کہ اگر فلاں قبیلہ کا آدمی مارا جائے گا تو آدھی دیت دی جائے گی اور اگر فلاں قبیلہ کا آدمی مارا جائے تو پوری دیت دی جائے گی۔ فلاں قبیلہ کا آدمی مارا جائے گا وہ دگنی دیت ادا کی جائے گی۔ فلاں قبائل کا سردار مارا جائے گا تو قاتل قبیلہ کے چار سرداروں کو مارا جائے گا۔ اس طرح کے رائج الوقت نظام میں پہلی مرتبہ مساوات انسانی ایک قانونی اصول کے طور پر اختیار کی گئی۔

سَوَاسِيَةٌ لَا فَرْقَ بَيْنَ صَغِيْرٍ وَكَبِيْرٍ غَنِيٍّ وَفَقِيْرٍ۔

یہ سب برابر ہوں گے، چھوٹے اور بڑے اور غنی اور فقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔ پھر مزید وضاحت کے لیے کہا گیا کہ:

تَتَكَافُوْ دِمَائُهُمْ وَدِيَتُهُمْ وَاحِدَةٌ

ان سب کے خون ایک دوسرے کے برابر ہوں گے اور دیت سب کی ایک ہی جیسی ہو گی۔ پھر فرمایا گیا کہ ذِمَّةُ اللهِ وَاحِدَةٌ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو گارنٹی دی گئی ہے وہ سب کے لیے برابر ہے اور ایک جیسی ہے۔ اِنَّ الْمُؤْمِنِیْنَ یُحْلٰی کُلٌّ مِنَ الاٰخِرِ، سب اہل ایمان ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اسی طرح سے پہلی مرتبہ قبائلی تعصّبات سے بالاتر ہو کر جنگ اور صلاح کا اختیار ایک مرکزی حکومت کو دیا گیا۔ اس سے پہلے ہر قبیلہ بلکہ ہر فرد آزاد تھا کہ جب چاہے جنگ شروع کرے اور جس کے خلاف چاہے ہتھیار اٹھائے۔ اس دستاویز میں یہ کہا گیا کہ سلم المومنین واحدہ، مسلمانوں کی مصالحت اور امن کا نظام ایک ہو گا۔

لَا یُسَالِمُ مُؤْمِنٌ دُوْنَ مُومِنٍ

کوئی ایک صاحب ایمان دوسرے کو چھوڑ کر کسی سے جنگ یا صلح کا معاملہ نہیں کرے گا۔

اِلَّا عَلٰی سَوَاءٍ وَعَدْلٍ بَیْنَہِمْ

سوائے اس کے کہ سب کے لیے ایک جیسا نظام ہو اور عدل کے ساتھ سب کے لیے ایک جیسا نظام اختیار کیا جائے گا۔

یہودی جب اس چارٹر میں غزوہ بدر کے بعد شامل ہو گئے تو ان کے لیے بعد میں ۲۴ مزید دفعات کا اضافہ کیا گیا۔ ان میں پہلی دفعہ میں ہے۔

وَاِنَّ یَهُوْدَ بَنِی عَوفٍ امة مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ

بنی عوف کے یہودی مسلمان کے ساتھ ساتھ ایک الگ امت ہوں گے۔

لِلْیَهُوْدِ دِیْنُهُمْ وَلِلْمُسْلِمِیْنَ دِیْنُهُمْ

یہودیوں کا اپنا دین ہو گا اور مسلمانوں کا اپنا دین ہو گا۔ دونوں جنگ کے دوران اپنے اپنے اخراجات برداشت کریں گے۔

یہ میثاق جو سنہ دو ہجری میں جاری ہوا۔ انسانی تاریخ میں پہلا تحریر اور مدون دستور ہے۔ حجاز اور عرب کی تاریخ میں بھی پہلی مرتبہ ایسی دستاویز مرتب ہوئی۔ صحابہ کرام کے

پاس اس دستاویز کی نقلیں موجود رہیں۔ صحابہ کے خاندانوں میں ان نقول کی بہت اہتمام سے حفاظت کی جاتی تھی۔ امام بیہقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق کے خاندان میں ایک صاحب کے پاس میں نے اس کی نقل دیکھی ہے۔ امام بیہقی کا انتقال ۴۵۸ھ میں ہوا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ ۴۵۸ھ تک اس کی نقلیں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے خاندانوں میں موجود تھیں۔

الغرض مدینہ منورہ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ تمام بلکہ باہم متحارب اور مختلف قبائل کی بنیاد پر ایک ریاستی نظم و نسق قائم کیا گیا، اس کی سربراہی اتفاق رائے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنبھالی اور یوں اس طویل جنگ و ابتلاء کی روایت ختم ہو گئی جو مدینہ منورہ کے مختلف قبائل کے مابین جاری تھی۔

اس میثاق اور معاہدے کے نتیجے میں مسلمانوں کا یہ پہلا اسلامی ریاست اور مملکت مدینہ منورہ میں قائم ہوا۔ جو آہستہ آہستہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین، بنو امیہ، بنو عباس کے دور تک لاکھوں مربع میل تک ایک عظیم خلافت کی شکل اختیار کر گیا (الحمد للہ علی ذالك)، لیکن افسوس جو چند صدیوں پہلے خلافت مغلیہ اور خلافت عثمانیہ کے زوال پر عارضی وقت کے لیے اختتام پذیر ہوا جس کی سزا تمام مسلمانان عالم آج تک بھگت رہے ہیں۔

ریاست مدینہ کا نظم و نسق

مدینہ کے ریاست کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظم و نسق کے لیے کیا کیا اقدامات کیے اور اسکا کیا نتیجہ نکلا۔اس سلسلے میں پہلی بات یہ ذہن نشین ہونی چاہیے کہ مدینہ میں پہلے سے کوئی حکومت نہ تھی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی اور نہ یہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وراثت میں ملی تھی۔نہ وہاں کوئی باضابطہ حکومت تھی، نہ فوج، نہ خزانہ، نہ کوئی اور شئے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کی ابتداء کی اور نقطہ صفر سے عروج تک پہنچانے لگے۔

بہر حال عہد نبوی میں مدینہ کی ریاست ایک کثیر القبائل، کثیر المذہبی اور کثیر الثقافتی حکومت تھی جس میں بالادستی شریعت کو حاصل تھی۔آخری قانون اللہ اور اس کے پیغمبر کا فرمان تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں بطور حاکم اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔ تمام فریقوں کو داخلی خود مختاری بھی دی گئ اور سابقہ روایات کی اچھی چیزوں کو اس میں جگہ بھی دی گئ۔ اسلام کا ایک مزاج جو مدینہ منورہ کے دور میں بہت نمایاں ہوا، وہ دوسری اقوام اور دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں کی مثبت اور تعمیری چیزوں کو اپنا لینے اور اپنے نظام میں سمو لینے کا ہے۔ مسند امام احمد کی روایت میں حضور نے فرمایا کہ:

يُعْمَلُ فِي الِاسْلَامِ بِفَضَائِلِ الجَاهِلِيَّةِ،

کہ اسلام میں جاہلیت کے زمانہ کی تمام فضیلتوں اور اچھی باتوں پر عمل کیا جائے گا۔

اس لیے کسی بھی قوم، کسی بھی علاقہ یا کسی بھی زمانہ میں جو بھی اچھی چیز مروج ہے تو اس کو اسلامی نظام میں اختیار کرکے قبول کیا جائے گا اور کسی اچھی بات کو اس بنیاد پر مسترد نہیں کیا جائے گا کہ وہ کسی غیر اسلامی پس منظر سے آئی ہے۔

نقبا کی تقرری:

ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں باقاعدہ نظم و نسق قائم کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کے نقبا کی تقرری کے کام کو مکمل فرمایا۔ اس دستاویز یا دستور کے بعد جب مدینہ منورہ کے داخلی نظم و نسق کے کام سے ذرا فرصت ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آس پاس کے قبائل پر توجہ دی اور ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے رابطوں کا آغاز فرمایا۔ اس غرض کے لیے مختلف قبائل میں بہت سی مہمات بھی بھیجی گئیں۔ پہلی مرتبہ جو دستہ بھیجا گیا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم محترم حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں مدینہ منورہ کے جنوب میں بنی ضمرہ کے قبیلہ میں بھیجا۔ وہاں ان گفتگوؤں اور مہمات کے نتیجہ میں ایک معاہدہ ترتیب دیا گیا جو آج بھی موجود ہے۔ عہد نبوی کے وثائق کے مجموعوں میں دستیاب ہے۔ اسی طرح مدینہ منورہ کے شمال میں جہینہ قبیلہ کے پاس ایک دستہ بھیجا گیا۔ ان سے بھی دوستی کا معاہدہ ہوا اور وہ بھی اس بندوبست میں شامل ہو گئے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو مدینہ منورہ کی بنیادی ریاست تھی جو معاہدہ کے شرکاء پر مشتمل تھی۔ پھر مدینہ منورہ کے وہ آطام یا بستیاں تھیں جو معاہدہ میں تو شریک نہیں تھیں، لیکن عملاً انہوں نے اس معاہدہ کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے بعد ایک دوسرا دائرہ آپ کہہ سکتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے چاروں طرف ایک حلقہ اثر کی صورت میں قائم کیا۔ اس دائرہ میں مدینہ کے چاروں طرف بسنے والے قبائل کی دشمنیوں کو ختم کرنا اور ان کو اسلام کے حق میں مائل کرنا اور مسلمانوں سے دوستی کرنے کے لیے آمادہ کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے جنوب میں ان قبائل سے رابطے ہوئے جو مکہ مکرمہ کے راستہ میں تھے، بنو ضمرہ سے، پھر بنو جہینہ سے معاہدہ کیا گیا۔ پھر مزینہ کا قبیلہ جو بہت بڑا قبیلہ تھا اور مدینہ منورہ کے مغرب میں آباد تھا ان سے معاہدہ کیا گیا۔ یہ سب معاہدات ہجرت کے بہت ابتدائی دنوں میں اور بہت کامیابی کے ساتھ ہوئے۔ ان دوستانہ معاہدات سے مدینہ کے دفاع کو منظّم کرنے اور مسلمانوں

کو امن وسکون فراہم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

مردم شماری:

مدینہ منورہ تشریف لانے کے فوراً بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردم شماری بھی کروائی۔ صحیح مسلم کی روایت ہے۔آپ نے فرمایا:

اُكْتُبُوْلِي مَنْ تَلَفَّظَ بِالْاِسلاَمِ

میرے لیے ان تمام لوگوں کی ایک فہرست تیار کر دو جو مسلمان ہو چکے ہیں۔ گویا مسلمان باشندوں کی پہلی مردم شماری ہجرت کے بعد ہوئی۔ اس کی تاریخ کے بارے میں سیرت نگاروں میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا۔ بعض سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ایک مرتبہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے فوراً بعد اور دوسری مرتبہ کچھ عرصہ بعد پیش آیا۔ ممکن ہے یہ واقعہ کئی مرتبہ آچکا ہو، لیکن مدینہ منورہ آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردم شماری کرائی۔ اور صحابہ کرام کے اسمائے گرامی کا پہلی مرتبہ ریکارڈ مرتب کیا گیا۔

امن وامان:

مدینہ منورہ میں سب سے پہلا انتظامی معاملہ جو حضور کے سامنے پیش تھا، وہ امن و امان کا مسئلہ تھا کہ ان متنوع قبائل کی موجودگی میں، جن میں لگ بھگ آدھے دشمن قبائل تھے، شروع میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، ان سب میں امن وامان کیسے قائم کیا جائے۔ خاص طور پر باہر سے آنے والے مسلمانوں کو سیکیورٹی کیسے فراہم کی جائے۔ مدینہ منورہ میں جرائم کے واقعات پہلے کثرت سے ہوتے رہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد جرائم میں بہت کمی آگئی، لیکن پھر بھی قتل، چوری، بدکاری، شراب خوری اور ڈاکہ اور اغواء وغیرہ کے واقعات رونما ہوتے تھے۔ ایک ایک کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان واقعات کا سد باب کیا۔ راتوں کو مدینہ منورہ میں پہرے کا انتظام بھی کیا۔ بعض افسران کا تقرر

بھی کیا جن کو ہم پولیس افسران کہہ سکتے ہیں۔

تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری، جو ایک نمایاں انصاری سردار تھے، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے امن وامان کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس طرح ان کو ہم مدینہ کا پہلا پولیس افسر کہہ سکتے ہیں۔ ان کے مقرر کردہ کارندے ہوتے تھے جو شہر کے مختلف علاقوں اور قریب کے دیہاتوں میں جا کر امن وامان کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر ان علاقوں میں امن وامان کا فریضہ انجام دیتے تھے جہاں مسلمان آبادیاں زیادہ تھیں۔ جیسے جیسے مسلمان آبادیاں بڑھتی گئیں، امن وامان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ غیر مسلم آبادیاں جیسے جیسے کم ہوتی چلی گئیں خاص طور پر تین بڑے یہودی قبائل کو نکالنے کے بعد جرائم میں بڑی نمایاں کمی آگئی۔ جرائم اور اس طرح کے واقعات کی بیشتر مثالیں ہجرت کے ابتدائی سالوں کی ہیں۔ بعد میں اس طرح کی مثالیں نسبتاً کم ہیں۔

ٹاؤن پلاننگ:

اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مدینہ منورہ کے مقامی نظم ونسق پر بھی توجہ دی۔ ٹاؤن پلاننگ کے بارے میں بعض ہدایات دیں۔ مدینہ منورہ کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ تعمیرات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ مکہ مکرمہ سے آنے والے بہت سے حضرات نے وہاں زمینیں خریدیں اور اپنے مکانات بنائے۔ چھوٹے مکان بھی بنائے گئے، بڑے مکان بھی بنائے گئے اور بعض صورتوں میں یہ بھی ضرورت پیش آئی کہ مکانات کے نقشے اس طرح سے بنائے جائیں کہ مدینہ منورہ کی آبادی کے لیے کسی مشکل کا ذریعہ نہ ہوں۔ چنانچہ گلیاں کیسے بنائی جائیں اور مکانوں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے، اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایات جاری فرمائیں۔ مدینہ میں کوئی نئی سڑکیں نہیں تھیں، بلکہ ایک قسم خودرو راستے تھے جس پر سے لوگ گزرتے تھے۔ سڑک بنانے، مرمت کرنے کی ضرورت نہ تھی، البتہ اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملتے ہیں۔

ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ گلی میں کم از کم سات ہاتھ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ گلی میں ایک طرف کے مکان اور دوسری طرف کے مکان کے درمیان فاصلہ کو ہاتھ کی لمبائی سے ناپا جاتا تھا۔ اگر ایک ہاتھ ڈیڑھ فٹ لمبا ہوتا ہے تو سات ہاتھ سے مراد یہ ہے کہ ساڑھے دس فٹ کے قریب چوڑی گلیاں ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے اس زمانے میں گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں۔ تانگے بھی نہیں ہوتے تھے۔ لوگ سواریوں پر سوار ہو کر سفر کرتے تھے۔ اس لیے اتنے فاصلہ میں دو سواریوں کا آسانی سے گزرنا ممکن ہے۔ اگر اس سے کوئی سبق ملتا ہے تو وہ یہ ہے کہ گلیوں اور سڑکوں میں اتنا فاصلہ ہونا چاہیے کہ آمنے سامنے سے آنے والی دو گاڑیاں بیک وقت گزر سکیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قانون سازی صرف دین کے لیے نہیں تھی بلکہ دنیاوی امور کے لیے بھی آپ قانون سازی کرتے رہے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاموں میں عربینزم بھی شامل تھی۔

تعمیرات:

مہاجرین کی آمد کا سلسلہ فتح مکہ تک جاری رہا۔ ان کی آباد کاری بھی ہوتی رہی۔ اس مقصد کے لیے مکانات بنانے کی ضرورت بھی پیش آتی رہی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی بڑی اور عالیشان عمارتوں کی تعمیر کی حوصلہ شکنی فرمائی۔ بعض صحابہ جو بڑے اصحاب ثروت میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے ذرا بڑے مکان بنانے کی خواہش ظاہر کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، جو رشتہ میں حضور کے ماموں بھی ہوتے تھے، مکہ مکرمہ کے مالدار لوگوں میں سے تھے۔ انہوں نے ایک بڑا مکان بنانا چاہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔ جب ان کو حضور کی ناپسندیدگی کی اطلاع ملی تو انہوں نے مکان کا وہ حصہ گرادیا جس کو دیکھ کر حضور نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ شہر میں آبادی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ بہت سے لوگ جو شہر میں آکر بس گئے تھے ضروری مالی وسائل نہیں رکھتے تھے۔ ان کے پاس

اتنے امکانات نہیں تھے کہ بڑے بڑے مکانات تعمیر کر سکیں۔اس لیے ان حالات میں اگر بڑی بڑی عمارتیں بنانے کی اجازت دیدی جاتی تو باہمی مسابقت کے پیدا ہونے کا امکان تھا کہ دولت مند اور اہل ثروت لوگ بڑے بڑے مکانات بنانے لگیں اور مدینہ منورہ میں جگہ کی قلّت ہو جائے اور یوں اس کی وجہ سے نئے آنے والوں کے لیے مکانات کی تعمیر مشکل ہو جائے۔ کشادہ اور آرام دہ مکان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرمائی اور ایک حدیث میں ایک مکان کی ضروریات کی نشاندہی بھی فرمائی کہ ایک مکان میں آدمی کے اپنے رہنے کے لیے کمرہ ہونا چاہیے، اس کے بچوں کے لیے کمرہ، مہمانوں کے لیے کمرہ، ملازموں اور خادم کے لیے کمرہ، اس کے علاوہ اگر غیر ضروری کمرے بنائے جائیں تو اس کو پسند نہیں فرمایا گیا۔اس سے اندازہ ہوا کہ جو ناگزیر ضروریات ہیں ان کا بندوبست مکان میں ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ غیر ضروری طور پر بڑے بڑے مکان بنانا اور شان و شوکت کا اظہار کرنا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے۔

سیکٹریٹ:

مدینہ کے نظم و نسق کے حوالے سے ایک اہم اقدام سیکٹریٹ کا انتظام تھا، یعنی چند آفیسر ہو جن کے ذمے لکھنے پڑھنے اور اندراج اور ریکارڈ کا کام ہو۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کے مختلف کام تھے۔ بعض افراد وحی کو لکھتے تھے، بعض زکوۃ کے اندراجات کے لیے مقرر تھے کہ کتنی رقم وصول ہوئی، کتنی خرچ ہوئی، کہاں خرچ ہوئی اور کس نے وصول کی۔

مال غنیمت کا طریقہ کار جاہلیت کے طریقے پر نہیں رکھا گیا کہ جس سپاہی نے جو وصول کیا وہ اسی کا ہے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام وصول شدہ غنیمت ایک جگہ جمع کر کے سارے سپاہیوں کو اس میں سے برابر کا حصہ دلایا جائے۔ تو اس کے اندراج اور تقسیم کے لیے بھی خصوصی کاتب تھے۔اسی طرح ہر شعبہ کے لیے تقریباً الگ الگ کاتب ہوا کرتے تھے۔اسی طرح ایک کاتب اس پر بھی مقرر تھا کہ جو سپاہی جہاد کے لیے ہر وقت تیار ہوں اور ہر وقت

ریاست انہیں بلائیں تو وہ حاضر ہونگے تو وہ ان کے نام اور تنخواہ وغیرہ کا ریکارڈر کھتا تھا۔

وزارت:

ریاست مدینہ میں وزراء بھی ہوتے تھے۔ ظاہر ہے آج کی طرح کی وزارتیں نہیں ہوتی تھیں کہ الگ الگ وزارت اور عملہ ہو اور نہ اتنی زیادہ وزارتیں اور دفاتر تھے جو آج کل ھم بیسویں صدی میں آس پاس دیکھتے ہیں، کیونکہ ریاست ابتدائی تھی اور شعبہ جات کم تھے، مثلا نئی سڑکیں بنانے، مرمت کرنے کا کام وہاں نہیں تھا تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے وزارت بھی نہیں تھی، نہ ناظم نہ انجینئر البتہ اس سلسلے میں ہدایات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھیں، البتہ مختلف معاملات پر مشورہ لینے کے لیے اور ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے کے لیے بعض صحابہ کرام متعین تھے۔ تقریباً تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حیثیت وزیر اول کی سی تھی۔ امام حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں سعید بن مسیب سے روایت کی ہے کہ

كَانَ اَبُوبَكْرٍ مِنَ النَّبِيِ صلی اللہ علیہ وسلم مَكَانَ الْوَزِيرِ،

کہ حضرت ابو بکر کا درجہ حضور کی بارگاہ میں وہی تھا جو وزیر کا ہوتا ہے۔

فَكَانَ يُشَاوِرُهُ فِي جَمِيعِ اُمُورِهِ "ہر معاملہ میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔"

وَلَمْ يَكُنْ رَسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يُقَدِّمُ عَلَيْهِ اَحَدًا،

اور کسی کو بھی ان کے اوپر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح اہم کاموں کے لیے بھی وزراء موجود تھے۔

ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اچھے حاکم کو اچھے وزیر عطا فرماتا ہے اور برے حاکم کو برے وزیر عطا فرماتا ہے۔ جب کوئی حاکم اچھے کام کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کو اس کی ٹیم میں شامل کر دیتا ہے اور جب برے کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو برے لوگوں کو اس کی وزارت میں شامل کر دیتا ہے۔

ریاستِ مدینہ کا تعلیمی نظام

اسلام کی نظر میں تعلیم کی اہمیت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملتے ہی غار حرا میں پہلی وحی اقرء سے شروع ہوئی اور پہلی وحی میں علم بذریعہ قلم بتایا۔ اَلَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ۔ مطلب یہ ہوا کہ انسانی تمدن اور تہذیب اور اس کی ترقی، تعلیم، قلم اور لکھنے پڑھنے سے ہے۔ ایک علم اور معلومات حیوانات کا ہے اور دوسرا علم اور معلومات انسانوں کا ہے۔ حیوانات کا علم نہیں بڑھتا، جبکہ انسانوں کا علم بڑھتا رہتا ہے، ترقی پذیر ہے، کیونکہ ایک تو ان کے اپنے آبا و اجداد اور بڑوں کا علم و تجربہ اور معلومات منتقل ہوتے رہتے ہیں اور دوسرا اس کا اپنا تجربہ اور تیسرا سوسائٹی، ماحول اور دوسروں کی معلومات، تجربات اور علم سے بھی استفادہ کرتا رہتا ہے۔ اس لیے قرآن پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا

اللہ تعالیٰ سے اپنے علم کے اضافے کے لیے اس طرح دعا کیا کرو کہ اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔ اسی بناء پر اسلام نے اِقۡرَاء اور عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ سے وحی کی شروعات کی ہے، کیونکہ یہی علم انسانی سماج، تمدن اور تہذیب کے ترقی کا ذریعہ ہے۔ علم کی اس اہمیت کے ساتھ ساتھ اسلام نے تعلیم اور علم پر کچھ پہرے اور حدود بھی مقرر کیے ہیں۔ اسلام کے ہاں وہ تعلیم اور علم مفید اور مطلوب ہے جس کے ذریعے اللہ سے تعلق جڑ جائے، جو دنیا یا آخرت کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہو اور مخلوق خدا کی خدمت اور خیر خواہی کا ذریعہ بن جائے۔ اسلام کے پیش نظر ایسا علم اور تعلیم مطلوب نہیں، بلکہ مبغوض اور ملعون ہے جو اللہ تعالیٰ سے دوری، انکار و الحاد کا سبب بنتا ہے اور جو مخلوق خدا کی خیر خواہ بن جانے کی بجائے انسان خور اور آدم خور بن جائے۔

جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے:

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

تعلیم بذریعہ خط و کتابت:

بہر حال عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظام تعلیم اور تعلیم کا بندوبست موجود تھا، اس حوالے سے عرب کا صورت حال کچھ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ مکہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج سرے سے نہیں تھا، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی امی کہلائے۔ یہاں لکھنے پڑھنے کا رواج ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے والد حرب سے شروع ہوا۔ عراق ھیرہ سے ایک شخص مکہ آیا اس نے حرب کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس نے شکر گزاری کے طور پر حرب کو بتایا کہ اپنے معاملات کے چیزوں کو بول جانے کی بناء پر اسے لکھا کرو۔ اور اس نے حرب کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ گویا کہ خط و کتابت کا رواج عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ عرصہ پہلے ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے ابھی زیادہ ترقی بھی نہیں کی تھی۔ ھیرہ سے آنے والے شخص نے جو خط سکھایا تھا وہ یقیناً اپنے علاقے اور رواج کے مطابق تھا، جس میں ۲۴ حروف تھے اور عربی میں ۲۸ حروف ہیں۔ اس میں ہم شکل حروف میں امتیاز کرنا بھی مشکل امر تھا جیسے ت، ب، ی، ن، جب یہ چھوٹے ہوں تو ہم شکل ہوتے ہیں تو ان حروف میں فرق نقطوں ہی سے ممکن تھا۔ لہٰذا ان نقطوں کا رواج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ہوا۔ خطیب بغدادی نے ایک روایت نقل کیا ہے کہ یہ کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا۔ لہٰذا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے سیکرٹری کاتب عشّان کو املا کرواتے وقت فرمایا کہ اس کو رقش کردو۔ تو کاتب نے پوچھا یا امیر المومنین رقش کیا چیز ہے۔ تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے تبسم کرکے فرمایا کہ ایک دن میں مدینہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاتب کی حیثیت سے لکھ رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لکھو اور رقش کرو۔ میں نے بھی پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رقش کیا چیز ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حرف پر جہاں ضرورت ہو وہاں نقطے لگاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف پر نقطے بعد کی چیز نہیں، بلکہ حضور کے زمانے میں پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے تحقیق کے مطابق مصر میں جھیلوں پر لکھی ہوئی چیزیں

دریافت ہوئی ہیں جن میں دو خط بھی پائے گئے، جو سن ۲۲ ہجری یعنی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے کے ہیں ان پر بھی نقطے پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عمر فاروق اور امیر معاویہ کے زمانے میں نقطوں کا کچھ نہ کچھ جو رواج ہے اس کو حجاج بن یوسف اور بعد کے زمانے کا کہنا درست معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی پہلی عربی میں لکھی گئی کتاب قرآن مجید ہے اس سے پہلے عربی زبان کی کوئی کتاب نہیں تھی، البتہ چند ایک چیزیں ملتی ہیں جیسے سبعہ معلقات جو خانہ کعبہ میں اعزاز واکرام کے طور پر لٹکائے جاتے تھے اسی طرح معاہدات بھی لکھے جاتے ہوں۔

الفہرست میں ابن ندیم نے لکھا ہے کہ خلیفہ مامون کے خزانے میں ایک مخطوطہ (کاغذ کا پرچہ) جس پر دھبے خط کی کچھ عبارت تھی اس نے لکھا ہے کہ وہ عورتوں کے خط کے مشابہ تھا اور یہ عبد المطلب کا خط تھا، لیکن پھر بھی عربی میں قرآن سے پہلے مستقل کتاب کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ بہر حال ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں خط کتابت کا آغاز ہوا تھا البتہ ابھی زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال خط کی تعلیم کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ توجہ رہی ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دار ارقم کو درسگاہ اور تربیت گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا۔ مدینہ منورہ میں ہجرت کرنے کے بعد تعلیم کا بندوبست اور نظام اور بھی وسیع اور منظّم ہوا۔

درس گاہیں اور تعلیم کی نگرانی:

مدینہ منورہ میں شروع میں نو مساجد اور بعد میں چالیس مساجد قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر مساجد میں درس و تدریس کا انتظام بھی تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت اس پورے درسی نظام کے سربراہ تھے۔ اگر کہا جائے کہ وہ اس ریاست کے پہلے وزیر تعلیم تھے تو شاید درست ہوگا۔ وہ تمام مساجد میں خود تشریف لے جاتے تھے۔ جہاں جہاں قرآن پاک کی تعلیم ہوتی تھی، اس کی نگرانی فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کے کچھ

عرصہ بعد مسجد میں ایک مخصوص حصہ تعلیم گاہ کے طور پر مختص کر دیا جسے صفہ کہتے ہیں۔ صفہ میں جو صحابہ زیر تعلیم تھے، ان کی نگرانی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود براہ راست فرمایا کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ ان پر ایک صحابی عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ نگران بھی مقرر تھے۔ صفہ مسجد نبوی میں ایک حصہ تھا جہاں صحابہ کرام بڑی تعداد میں مقیم تھے۔ باہر سے آنے والے صحابہ کرام اکثر و بیشتر صفہ میں ٹھہرتے تھے جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ یہ صحابہ کرام وہ تھے جو بعد میں بڑے بڑے فاتحین اور سردار بنے۔ فاتح شام حضرت عبیدہ بن الجراح بھی صفہ میں مقیم رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی بھی ایک زمانے میں صفہ میں مقیم رہے۔ مشہور راوی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی صفہ میں مقیم رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفہ میں ملنے والی تربیت کس انداز کی تھی۔

مدینہ منورہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج پہلے سے تھا۔ سوید بن صامت رضی اللہ عنہ جو حضرت لقمان حکیم کے حکمت نامہ سے واقف تھے اور اس کو پڑھتے بھی تھے۔ مدینہ منورہ میں بہت سے صحابہ تھے، جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے کئی حضرات ایسے تھے جو کامل کہلاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا بندوبست اور تعلیم کی نشر و اشاعت ہجرت کے فوراً بعد شروع ہوئی۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کفار مکہ میں جو قیدی جنگ بدر میں ہاتھ آئے تھے ان میں سے بہت سوں نے مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ یہ ان کا فدیہ تھا جس کے بدلے میں ان کو رہا کر دیا گیا۔

جو حضرات مدینہ منورہ میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے ان میں ایک نمایاں نام حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ جیسے جیسے دوسرے علاقے فتح ہوتے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تعلیم کے لیے لوگوں کو بھیجتے رہے۔ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو سترہ سال کی عمر میں یمن بھیجا تھا۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ

لِيُفَقِّهَهُمْ فِي الدِّينِ وَيُعَلِّمَهُمُ الْقُرآنَ

تاکہ ان کو دین کی سمجھ سکھائیں اور قرآن پاک کی تعلیم دیں۔ حضرت معاذ بن جبل کو فتح مکہ کے بعد کچھ دن کے لیے مکہ میں چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ تعلیم قرآن کے گشتی معلّمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں بھی مقرر فرمائے اور مدینہ میں بھی۔ مدینہ سے جن حضرات کو تعلیم قرآن کے لیے عرب کے مختلف قبائل اور علاقوں میں بھیجا گیا تھا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مدینہ منورہ کی مسجدوں اور تعلیمی مراکز میں جو صحابہ تعلیم دیا کرتے تھے ان میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ، اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ، خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے نام بڑے نمایاں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ جو ایک مہاجر صحابی تھے مسجد نبوی میں کتابت سکھایا کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

وَكَانَ كَاتِباً مُحْسِنًا

وہ بہت اچھے کاتب تھے۔ وہ بچوں کو کتابت سکھایا کرتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی خوش نویسی کے استاد تھے اور خوش نویسی سکھایا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں سے فنی اور تجربی علوم کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت کو یہودیوں کی زبان سیکھنے کے لیے یہودیوں کے مدارس میں بھیجا۔ منجنیق میں مہارت حاصل کرنے کے لیے صحابہ کرام کو یمن بھیجا۔ مدینہ منورہ میں دار القراء کے نام سے ایک بڑا مکان تھا جہاں بڑی تعداد میں قرآن پاک کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ وہاں بڑی تعداد میں طلبہ اور اساتذہ ٹھہرا کرتے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر کے بارے میں آتا ہے کہ جب مدینہ آئے تو اس مکان میں ٹھہرے جس کو بعد میں دار القراء کہا گیا۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ بھی اس مکان میں ٹھہرے۔

نصاب تعلیم:

قرآن پاک، دین اور فقہ کے ساتھ ساتھ جن دوسری چیزوں کی تعلیم دی جاتی تھی ان کی فہرست التراتیب الاداریہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں یہ چیزیں شامل ہیں، فلکیات، تیر اندازی، تیراکی، عربی زبان وادب، طب، قیافہ، طریقہ حرب، تجارت، ترجمہ اور مختلف زبانیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نصاب تعلیم کے متعلق جو ان کی رائے اور استنباط ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مختلف علوم اور فنون کی اہمیت سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان ان کو سیکھ لے، اس کے لیے الگ الگ درسی کتابوں کے بجائے ایک ہی درسی کتاب پسند فرمایا اور چاہتے تھے کہ ایک شخص اس ایک کتاب کو ہمیشہ پڑھتا رہے۔ چاہیے وہ اپنی فن کے متعلق پڑھنا پسند کرتا ہو یا دیگر فنون کے متعلق پڑھنا چاہتا ہو اور وہ ہے قرآن مجید۔ قرآن مجید کو اگر انسان بار بار پڑھتا رہے تو وہ اس میں اپنی فن کی چیز کو بھی پڑھے گا اور ضمناً اور فنون کے چیزوں کو بھی سرسری نظر سے پڑھے گا اور سمجھنے کی کوشش کرے گا اور کبھی نہ کبھی ضرورت کے وقت یہ دوسری فنون بھی اس کے کام آئے گی۔ چنانچہ اس نظر سے اگر ہم قرآن پر نظر ڈالیں تو ہم کو اس میں بے شمار علوم اور فنون کا ذکر نظر آنے لگے گا۔ اس میں صرف دینی چیزوں عقائد، عبادات، اخلاق، وغیرہ کا ہی ذکر نہیں ہے، بلکہ اس میں ہمیں دیگر علوم بھی نظر آتے ہیں اس میں تاریخ کا ذکر ہے، اس میں ان علوم کا بھی ذکر ہے جس کو ہم "اکزکٹ سائنسس" کہتے ہیں کا بھی تذکرہ ہے مثلاً قرآن میں باٹنی کا ذکر ہمیں کثرت سے نظر آتا ہے، مناظر قدرت کا بہت تذکرہ ہے، اس طرح اسٹرانمی کا بھی ذکر آتا ہے اس میں جینیالوجی اور امبریالوجی یعنی نطفے سے لے کر بچے کی پیدائش تک اور بچے کی پرورش پانے کا ذکر بھی ملتا ہے اور بہت تفصیل کے ساتھ، جس کا اثر آج تک ہے۔

پیرس کے ایک سرجن ڈاکٹر موریس بوکائے نے کتاب لکھی ہے "بائبل قرآن اور سائنس" اس نے کتاب میں لکھا ہے کہ علم الجنین کے بارے میں جو تفصیلات قرآن میں ہے

اس کا علم نہ یونان کے مشہور قدیم طبیبوں کو ہے جیسے ارسطو، افلاطون وغیرہ اور نہ یورپ کے ڈاکٹروں کو حال حال تک اس کی تفصیلات معلوم تھی، لیکن آج سے چودہ سو سال پہلے ایک امی صحرا نشین اس کا ذکر کرتا ہے تو یقیناً یہ انسان کا کلام نہیں، بلکہ اللہ پاک کا کلام ہو سکتا ہے جن کا علم غیر تغیر پذیر ہے اور جدید ترین سائنس بھی امبریالوجی کے متعلق اس سے زیادہ کوئی چیز نہیں بتاتی، بلکہ اس قرآن کو توثیق کر لیتی ہے اور اسی وجہ سے وہ ڈاکٹر مسلمان بھی ہوئے اسی طرح قرآن میں جیالوجی، حیوانات، نباتات وغیرہ کے بے شمار علوم و فنون کا بیان موجود ہے، قرآن میں جہاز رانی اور طوفانوں کا بھی بیان ہے میرے گمان کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ ہر مسلمان کو بنیادی اور لازمی علم کے ساتھ ساتھ کچھ معلومات ایسی بھی حاصل کر لینے چاہیے کہ وہ کبھی کبھی کام آجائے اور اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن ہی کا انتخاب کیا کہ اس کو ہمیشہ پڑھو۔اسی طرح عہد نبوی میں تعلیم کے سلسلے میں ایک اور چیز ہے طب اور ڈاکٹری۔ حدیث اور سیرت کے کتابوں میں طبیبوں کی حالت اور جراحت کرنے والوں کی حالت کے بارے میں معلومات ملتے ہیں۔حدیث کی کتابوں میں باقاعدہ طب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے مستقل فن موجود ہے۔ جن میں بیماریوں کا بیان اور ان کے علاج معالجے کا تذکرہ موجود ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ الگ الگ بیماری کے لیے الگ الگ نسخہ تجویز کر کے بتایا ہے۔اُس زمانے کے مطابق طب اور میڈیکل کا شعبہ یہی تھا۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی بیمار ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لیے گئے۔ وہاں پوچھتے ہیں کہ ہمارے قبیلے اور محلے میں کون طبیب ہے۔ تو لوگوں نے دو طبیبوں کا نام لیا فلان اور فلان۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان میں جو ماہر تر ہے اس کو بلاؤ۔اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ سپیشلائیزیشن پیدا کرے اور ماہر سپیشلسٹ سے علاج کرائیں اور اپنے فن میں ماہر ہونے کی ترغیب بھی دی کہ اپنے فن میں مہارت حاصل کرو۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ جس شخص کو علم طب سے واقفیت نہیں اور وہ علاج کرتا ہے تو اسے سزا دی جائے گی، کیونکہ اس کے اناڑی فن سے بے قصور ایک بیمار آدمی نقصان اٹھا سکتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں علم طب کی کافی اہمیت سمجھی جاتی اور علاج مفردات کے ذریعے سے ہوتا تھا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے شمار نسخے منسوب ہیں۔لوگ آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے یارسول اللہ مجھے فلاں بیماری ہے، توآپ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے کہ تم فلاں چیز کھاؤ یا فلان چیز پیو۔اس طرح طب نبوی کا پورا نظام احادیث پر مشتمل ہو کر بن چکا ہے جس پر کئی کتابیں موجود ہیں۔

اسی طرح ایک اہم علم Astronomy فلکیات اور علم ہیئت ہے جس کی تفصیل قرآن میں موجود ہے اور اس کو بہت اہم تصور کیا جاتا تھا۔قرآن نے خود بتایا ہے کہ اس کے ذریعے تم کو اپنا راستہ معلوم ہوسکے گا اور اس کے ذریعے تم اپنے اوقات اور حج کے زمانے کا تعین کر سکو۔اس علم کو بھی کافی توجہ کی جاتی تھی اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کے متعلق بہت واقفیت تھی، کیونکہ مدینہ میں پہلے قبلہ بیت المقدس اور پھر خانہ کعبہ مقرر ہوا تھا تو قبلہ کا رخ بغیر علم فلکیات کے کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔چونکہ اُس زمانے میں سفر اکثر رات کو ہوا کرتا تھا اور لوگ ستاروں کی مدد سے اپنے مطلوبہ مقام کو پہنچ جاتے تھے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تجارت کے لیے بصرہ گئے تھے اور بیت المقدس سے ہو کر گزرے تھے۔لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے بیت المقدس کی طرف سفر کرنے والوں کو کس راستے سے جانا چاہیے۔اسی طرح دیگر حضرات بھی فلکیات اور ستاروں کے تعاون سے اپنا قبلہ معلوم کرتے تھے۔

اس طرح حدیث میں آتا ہے کہ لوگوں کو اپنے انساب سیکھنے چاہیے، میرا نام، میرے باپ کا نام، میرے دادا کا نام وغیرہ۔اس علم انساب کا عملی فائدہ ایک یہ بھی ہے کہ ان معلومات کی بنا پر کوئی اپنی محرم عورت سے نکاح نہ کرلے۔یہ علم صرف تاریخی معلومات کے لیے نہیں

بلکہ اس طرح کے دیگر امور کے لیے بھی کار آمد ہو سکتا ہے۔

اس طرح قرآن پاک میں تقابل ادیان کا مطالعہ بھی موجود ہے اور قرآن میں بہت سے مذہبوں کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا قرآن کے پڑھنے والوں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے بارے میں اپنی معلومات بڑھائیں جو تبلیغ کے سلسلے میں ان کے لیے کار آمد ثابت ہو سکتی ہے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے اعتراضات اور سوالات کی جواب دہی کے سلسلے میں بھی یہ معلومات کار آمد ہوتی ہے۔ دوسروں کے مذہب سے واقفیت بعض اوقات بہت مفید ہوتا ہے۔ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک فرانسیسی نن نے مجھ پر تعدد ازواج کے حوالے سے اعتراض کیا۔تو میں نے اس کو جواب دیا کہ اگر دوسرے لوگ یہ اعتراض کرے تو مجھے قبول ہے، لیکن تم سے مجھے اس اعتراض کی امید نہیں تھی اور نہ تم کو یہ حق پہنچتا ہے، کیونکہ آپ کے لیے اپنے مذہب عیسائیت کے مطابق نن کی حیثیت خدا کی بیوی کی ہے۔ تو میں نے کہا کہ تمہارے عقیدے کے مطابق تمہارے شوہر کی کئی لاکھ بیویاں ہیں اور ہمارے چار بیویوں پر تمہیں اعتراض ہے۔اس جواب سے اُس کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ دو سال خط وکتابت کے بعد اس نے اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گئی۔ بہر حال تقابل ادیان کے مطالعے کا یہ فائدہ ہے۔اس لیے قرآن میں اس علم کا بھی کافی تفصیل موجود ہے۔الغرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں علوم وفنون زیادہ نہ تھے البتہ جو موجود تھے وہ اسی زمانے کے لیے کافی بھی تھے اور ترقی پذیر بھی تھے۔

مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں مفتی اور قاضی بھی مقرر فرمائے تھے۔اس زمانے میں مفتی اور قاضی کا منصب ایک ہی ہوتا تھا۔ خلفائے اربعہ، عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ کے مفتی اور قاضی بھی تھے۔ ان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابو درداء رضی اللہ عنہ، حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ، ابو

موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اسمائے گرامی بھی نمایاں ہیں۔

وثیقہ نویسی اور زبان دانی:

دستاویزات کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دستاویزات کا شعبہ قائم فرمایا تھا، صحابہ کرام کو اس پر مقرر کیا۔ یہ سب حضرات بلا معاوضہ کام کیا کرتے تھے۔ ایک صحابی حضرت عبد اللہ بن الارقم رضی اللہ عنہ الزہری حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی کام کرتے رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی کام کرتے رہے اور تنخواہ نہیں لی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے پورے کام کا اندازہ لگا کر ایک تخمینہ لگایا اور ان کو تیس ہزار درہم تنخواہ بقایا جات سمیت دینی چاہی لیکن انہوں نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ:

اِنَّمَا عَمِلتُ لِلّٰہِ وَ اِنَّمَا اَجْرِیَ عَلَی اللّٰہِ

میں نے تو یہ سب کام اللہ کے لیے کئے ہیں اور اللہ ہی سے اس کا اجر لوں گا۔

مدینہ کے ریاست میں ایک شعبہ اور بھی تھا جس کو آپ شعبہ مراسلات اور وثائق بھی کہہ سکتے ہیں۔ شعبہ مراسلات اور وثائق کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خط کتابت اور دوسرے سرداروں اور حکمرانوں سے مراسلت کا ریکارڈ رکھنا تھا۔ اس شعبہ میں سب سے نمایاں خدمات حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ انجام دیا کرتے تھے۔

اس شعبہ میں عربی کے علاوہ عبرانی اور سریانی زبانوں میں بھی دستاویزات تیار کی جاتی تھیں۔ عبرانی زبان اُن یہودیوں میں مروج تھی جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے، جبکہ خیبر کے یہودیوں میں سریانی زبان مروج تھی، کیونکہ ان کی علمی زبان سریانی تھی۔ وہاں سے جو تحریر آتی تھی وہ سریانی میں آتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب عربی زبان میں جاتا تھا۔ جب ان کا خط آتا تھا تو پڑھنے کے لیے کسی یہودی کو بلاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے یہودیوں پر بھروسہ نہیں ہے۔ ممکن ہے

کہ غلط ترجمہ کر کے بتا دیں۔ اس لیے تم جا کر سریانی سیکھ لو۔ وہ یہودیوں کے ایک مدراس میں گئے جو یہود کے مدرسہ کو کہتے ہیں۔ انہوں نے سترہ دنوں میں سریانی زبان سیکھ لی اور واپس آ گئے۔ وہ سریانی کے علاوہ بھی کئی زبانیں جانتے تھے اور ان زبانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کیا کرتے تھے۔ دستاویزات کا ریکارڈ بھی رکھا کرتے تھے۔

یہ بات بہت سے سیرت نگاروں نے نقل کی ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی تھی۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ عرب کے یہودی خط و کتاب تو عربی ہی میں کرتے ہوں گے، لیکن ان کا رسم الخط عبرانی یا سریانی ہو گا۔ شاید اسی لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سترہ دنوں میں یہ زبان سیکھ لی ہو گی۔ بہر حال عام خطوط حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری تھی۔ جب کوئی اہم معاہدہ ہوتا تو وہ عموماً سیدنا علی بن ابی طالب تحریر فرمایا کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ سمیت کئی معاہدے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

ریاست مدینہ کا شعبہ امور خارجہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ریاست کے قیام کے بعد ریاست کے انتظامات پر بڑی توجہ دی اور اس ننھی سی ریاست میں مختلف شعبے قائم فرمائے۔ ہم آج کل کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک صیغہ خاص تھا۔ ایک توقیعات و فرامین اور دستاویزات کا شعبہ تھا، ایک شعبہ احتساب تھا، شعبہ داخلہ، شعبہ خارجہ، شعبہ مالیات، شعبہ عساکر یعنی فوجی نظم و نسق، شعبہ تعلیم، یہ سارے شعبے ایک ایک کرکے قائم کر دیئے گئے۔

شعبہ امور خارجہ کا قیام اور مقاصد:

سب سے پہلا اور ابتدائی کام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سربراہ ریاست کے طور پر کرنے کی ضرورت پیش آئی وہ شعبہ خارجہ کی تنظیم تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ تشریف آوری کے بعد سب سے اہم کام یہی تھا کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو دشمنوں کے اس سمندر میں کیسے محفوظ و مامون بنایا جائے۔ اس غرض کے لیے آس پاس کے قبائل سے روابط ناگزیر تھے۔ دستور مدینہ بھی ایک طرح سے مختلف قبائل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی بات تھی۔ اس میں بھی خارجہ معاملات کا ایک عنصر موجود تھا۔ پھر جہینہ، ضمرہ اور مزینہ کے ساتھ جو تعلقات اور معاہدے کیئے گئے وہ بھی امور خارجہ کی پہلی کڑی یا پہلا قدم تھا۔ اس سلسلہ کو جاری رکھنے میں حضور علیہ السلام کے سامنے تین مقاصد تھے۔ یہ وہ مقاصد ہیں جن کی کہیں تو صراحت ملتی ہے اور کہیں ان معاہدات کے الفاظ سے ان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سب سے بنیادی ہدف یہ تھا کہ دعوت اسلامی کو فروغ دیا جائے اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیا جائے۔ چنانچہ مختلف قبائل کے ساتھ ہونے والوں معاہدوں میں اس کی طرف اشارے موجود ہیں کہ وہ مسلمانوں کے داعیوں کا راستہ نہیں روکیں گے، مسلمان داعی اگر کہیں جا رہے ہوں تو ان کو مہمان نوازی اور تحفظ فراہم کریں گے،ان کو اپنے ہاں ٹھہرائیں گے اور اس کے

بدلے مسلمان بھی ان کا بھرپور خیال رکھیں۔

ان معاہدات کا دوسرا بڑا مقصد یہ تھا کہ عرب کے معاشرہ میں امن و امان قائم ہو۔ عدل و انصاف کو فروغ ہو اور تمام قبائل کو اس طرح سے ایک لڑی میں پرو یا جائے کہ وہ ان مشترکہ مقاصد کی خاطر عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ پھر آخری مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست اور امت مسلمہ کا ایک رعب اور دبدبہ عرب میں قائم ہو کہ کوئی دوسری قوت ان کی طرف میلی نظروں سے نہ دیکھ سکے۔ ریاست مدینہ کی خارجہ پالیسی کے یہ تین بنیادی اہداف تھے جن کے تحت معاہدات کئے گئے۔ اور اس طرح تبلیغ اسلام کو آسان بنایا گیا، اندرونی استحکام کو یقینی بنا گیا، انسانی جان کے تحفظ کا بندوبست کیا گیا۔ دشمنوں پر معاشی دباؤ قائم رکھنے کے سامان کئے گئے۔ دشمن کے دوستوں سے دوستی کی کوشش کی گئی۔ دشمن کے دشمنوں سے دوستی مزید بہتر بنائی گئی۔ دشمن کے اطراف میں اپنے دوستوں کی ایک ڈھال بنائی گئی۔ یعنی خیبر کے یہودیوں کے اطراف میں بھی اور قریش مکہ کے اطراف میں بھی بسنے والے قبائل کے ساتھ دوستانہ معاہدے کئے گئے۔ دشمن قبیلوں کے درمیان اگر کوئی اتحاد تھا تو اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ معزز دشمنوں کا احترام کرکے ان کا دل جیتنے کی کوشش کی گئی۔

شعبہ تالیف قلب:

تالیف قلب ریاست کے شعبہ خارجہ کی پالیسی کا ایک اہم حصہ تھا۔ تالیف قلب کے طور پر بہت سے اقدامات کئے گئے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں قحط کا سامنا کرنا پڑا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے بڑی تعداد میں کھجوریں اور جو کی کمیت بھیجی اور کہلا بھیجا کہ ہماری طرف سے یہ سامان خوردونوش مکہ کے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح کے اقدامات وقتاً فوقتاً کئے گئے۔ یہ صیغہ خارجہ تھا جس میں بنیادی ذمہ داری سیدنا عمر فاروق کی تھی۔ ان کا قبیلہ مکہ مکرمہ میں بھی شہری ریاست میں امور خارجہ اور سفارت کا ذمہ دار تھا۔

شعبہ سفراء:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مہمات بھیجیں ان سب کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ابتدائی سالوں میں بہت کثرت سے مہمات بھیجی گئیں۔ مدینہ منورہ کے چاروں طرف حتیٰ کہ مکہ مکرمہ کے قریب کے رہنے والے بعض قبائل کے ساتھ دوستانہ معاہدات کئے گئے۔ اسی اثناء میں حضور نے سفیر بھی بھیجے۔ بعض سفیروں کے نام بھی ملتے ہیں ۔ایک سفیر جن کو کئی مواقع پر حضور نے بھیجا اور اس زمانے کی سب سے بڑی ریاست کے حکمران کے پاس بھیجا وہ دحیہ بن خلیفہ الکلبی رضی اللہ عنہ تھے۔ بنی کلب سے آپ کا تعلق تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اور بااثر قبیلہ تھا۔

ان کے بارے میں ایک بات تمام سیرت نگاروں نے لکھی ہے کہ صحابہ کرام میں ان سے زیادہ خوبصورت آدمی کوئی نہیں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قیصر روم کے دربار میں بھی بھیجا تھا۔ جب وہ قیصر روم کے پاس دمشق پہنچے اور بتایا گیا کہ عرب سے ایک بہت خوبصورت سفیر آیا ہے تو تمام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ عورتیں کھڑکیوں اور دروازوں میں اس خوبصورت نوجوان کو دیکھنے کے لیے کھڑی تھیں، جو عرب سے پیغمبر عربی کا خط لے کر آیا ہے۔

جب کبھی جبرئیل امین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے تو دحیہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ کی شکل میں آتے تھے۔ کئی مرتبہ صحابہ کرامؓ نے بیان کیا کہ ہم نے دحیہ کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو ریاست سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ حضور کے بتانے سے لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ جبرئیل امین تھے جو دحیہ بن خلیفہ الکلبی کی شکل میں کئی بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔

بقیہ سفیروں میں حضرت عمرو بن امیہ الضمری کا تذکرہ بھی آتا ہے جو نجاشی کے دربار میں نامہ مبارک لے کر گئے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے ہی اسلام قبول کر

کے مدینہ منورہ آئے تو ان کو سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ مختلف حکمرانوں کے پاس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفیر جایا کرتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ مکتوب الیہ کے لیے کوئی ہدیہ بھی دیتے تھے۔ باہر سے کوئی سفیر آیا کرتا تو اس کو بھی ہدیہ دیا کرتے تھے۔ حضور کی طرف سے سفیروں کو ہدیہ دیا جانا اتنا طے شدہ طریقہ کار تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بستر مرگ پر تھے اور دنیا سے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ:

اَجِیزُوا الوُفُودَ کَمَا کُنتُ اَجِیزُهُم

جیسے میں مختلف وفود کو ھدیہ وانعامات دیا کرتا تھا تم بھی ھدیہ وانعامات دیتے رہنا اور ہر آنے والے سفیر کو کوئی نہ کوئی انعام دے کر بھیجنا۔

شعبہ مہمان داری:

وزارت خارجہ، کے ماتحت ایک شعبہ مہمانداری بھی تھا۔ اس کے سربراہ کچھ زمانے تک حضرت بلال رضی اللہ عنہ رہے۔ پھر ایک صحابی معقیب بن ابی فاطمہ الدوسی، جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے قبیلہ کے تھے، اس شعبہ کے نگران ہوئے۔ ان کو آپ افسر مہمانداری کہہ لیں یا چیف آف پروٹوکول کہہ لیں۔ دار الکبریٰ کے نام سے ایک بڑا مکان تھا۔ یہ مکان حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں اپنی تجارت چل پڑنے کے بعد بنایا تھا۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر یہ مکان خالی کرکے شعبہ مہمانداری کو دے دیا۔ یہاں باہر سے آنے والے وفود کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا۔ جب تعمیر ہو رہا تھا تو کئی مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس مکان میں کھجوروں کے کئی درخت بھی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان اس مکان میں ٹھہرائے جاتے تھے۔

ایک اور مکان تھا جو ایک خاتون رملہ بنت حارث رضی اللہ عنہ کا تھا۔ انہوں نے بھی ایک بہت بڑا مکان بنایا تھا، اس کے ساتھ ایک باغ بھی تھا۔ باہر سے آنے والا کوئی وفد یا کسی

قبیلہ کا سفیر اس مکان میں بھی ٹھہرایا جاتا تھا۔ جب بنو حنیفہ کا وفد آیا تو اس میں اسی آدمی تھے، وہ سب کے سب حضرت رملہ رضی اللہ عنہ کے مکان میں ٹھہرے۔ دو وقت کا کھانا انہی کی طرف سے آتا تھا۔ کھانے کی تفصیل بھی موجود ہے کہ ایک وقت کا کھانا دودھ اور روٹی پر مشتمل ہوتا تھا جبکہ دوسرے وقت کا کھانا گوشت اور گھی پر مشتمل ہوتا تھا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ اس انتظام کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ ۹ ہجری میں خالد بن سعید بن العاص، چیف آف پروٹوکول تھے۔

ایک مرتبہ چار سو آدمیوں پر مشتمل قبیلہ مزینہ کا وفد آیا۔ وفد کا مقصد پہلے سے موجود معاہدہ کی تجدید اور از سر نو اسلام میں داخل ہونا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جو وزیر خارجہ تھے، ان کی دیکھ بھال اور مہمان داری کا بندوبست کرنے کے لیے فرمایا۔ ظاہر ہے کہ بڑے وفد کے لیے زیادہ ذمہ دار شخص سے کہا جائے گا۔ چھوٹے وفد کے لیے کم ذمہ داری والے افسر سے کہا جائے گا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا اپنے وزیر خارجہ کو یہ اہم ذمہ داری سونپی۔ جب وفد کی روانگی کا وقت آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق سے فرمایا کہ زَوِّدْهُم، ان کو جاتے وقت خاصی مقدار میں زاد راہ دے دینا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اتنے زیادہ لوگوں کو خاصی مقدار میں زاد راہ میں کہاں سے دے دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہیں سے بھی دے دو۔ یہ تفصیلی روایت موجود ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مختلف جگہوں پر گئے اور جائزہ لیا کہ چار سو آدمیوں کو کیا زاد راہ دوں، واپس آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ اتنے زاد راہ کا انتظام مشکل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رملہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے جس مکان میں وفد کو ٹھہرایا ہے اس میں بہت کچھ عمدہ کھجوریں لگتی ہیں وہی توڑ کر دے دو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں سیڑھی لگا کر وہاں گیا تو دیکھا کہ کھجوریں اتنی نہیں تھیں کہ اتنے زیادہ آدمیوں کے لیے کافی ہوتیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ حضور نے جیسے فرمایا ہے اسی طرح کرتے ہیں۔ ایک آدمی کو کھجوریں توڑنے پر لگایا اور ایک دوسرا آدمی ٹوکریاں

بھرنے لگا۔ باہر لیجا لیجا کر بنی مزینہ کے لوگوں کو دیتے رہے۔ چار سو آدمیوں کا زاد راہ مکمل ہو گیا اور درختوں میں کھجوریں جیسی تھیں ویسی ہی رہیں۔ میں نے جا کر حضور کو اطلاع کر دی کہ سب کو زاد راہ مل گیا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔

رملہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے مکان کے بارے میں سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ کَانَت دَارًا وَاسِعَۃً، بہت بڑی حویلی تھی۔ دار گھر کو نہیں بلکہ حویلی کو کہتے ہیں جس میں کئی گھر ہوں۔ اس میں کھجور کے درخت بھی تھے اور وفود عرب کو اس میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ بعض اوقات ایک وقت میں کئی کئی وفود آجاتے تھے۔ ایسی صورت میں کچھ لوگ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے گھر میں ٹھہرائے جاتے تھے، اس کے علاوہ کبھی کبھی حضرت مغیرہ بن شعبہ کا مکان بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود ضرورت اگر باقی رہتی تو مسجد نبوی کے صحن میں اور باہر خیمے لگوا کر مہمان ٹھہرائے جاتے تھے۔

ریاست مدینہ کا شعبہ عدلیہ و قضاء

امور خارجہ اور عسکریات کے علاوہ جو سب سے اہم شعبہ تھا وہ صیغۂ عدل و قضا تھا۔ اسلام آیا ہی عدل کے لیے ہے، اسلام کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں۔ اس لیے پہلی چیز جس کی طرف میثاق مدینہ میں بھی بار بار اشارہ موجود ہے اور حضور کے انتظامات میں بھی نظر آتا ہے کہ جو پہلا کام کیا گیا وہ عدل و قضا کا بندوبست تھا۔

زمانہ جاہلیت میں حکومت نہیں تھی تو عدالت بھی نہیں تھی۔ لوگ اپنا بدلہ اپنے زور یا پنج کے ذریعے لیتے تھے۔ یا مکہ میں طائف کے نزدیک سالانہ دو تین دن کے لیے عکاظ کا میلہ لگتا تھا اس میں موروثی حَکَم مقرر ہوتے تھے جو لوگوں کی تجارتی فیصلے کرتے یا عام جھگڑے بھی لوگ ان دونوں یہاں لاتے۔ مدینہ میں بھی اس طرح کا کوئی انتظام نہیں تھا کہ کمزور مظلوم کو انصاف مل جائے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور شہری ریاست قائم ہوئی اور دنیا کا پہلا تحریری دستور مرتب ہوا تو اس میں ایک عجیب و غریب حکم ملا، جس سے عدل و انصاف کا انقلاب آیا وہ حکم یہ تھا کہ

- انصاف بجائے فرد کے مرکزی چیز ہو گی۔ جس پر ظلم ہو جائے تو وہ خود ظالم کو سزا نہیں دے سکتا بلکہ اسلامی ریاست کا حاکم بغیر کسی رعایت کے ظالم کو سزا دے گا اور مظلوم کو حق دلائے گا۔
- اخلاقی حکم بھی اس سلسلے میں یہی تھا کہ کسی کو کسی ظالم کے حمایت کا حق نہیں ہو گا چاہے وہ اس کا باپ یا بیٹا کیوں نہ ہو۔ پھر اس کے بعد مدینہ کے ریاست میں دو عہدے مفتی اور قاضی کے مقرر ہوئے۔ مفتی سے علم، مسئلے کا حل اور معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے جبکہ ان کے فرائض میں حکم نافذ کرنا نہیں ہوتا مستفتی کو حکم معلوم ہونے کے بعد وہ خود اس پر عمل کرے اور قاضی کا فرض حکم نافذ کرنا ہے۔

روایت میں آتا ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مفتی مقرر ہوئے تھے کہ جس کو کوئی عام شرعی مسئلہ پوچھنا ہو یا قانون معلوم کرنا ہو تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، اس طرح کے عام مسائل میں میرا وقت بھی ضائع نہ کرے اور نہ میری مصروفیت کی بنا پر انتظار میں اپنا وقت ضائع کرے۔

ریاست مدینہ میں قاضی بہت مقرر ہوئے تھے۔ ہر قبیلے حتی کہ اقلیتوں کا بھی اپنے مذہب کے مطابق قاضی مقرر تھا۔مدینہ شہر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے بھی کسی خاص مسئلے میں قاضی مقرر ہوتے کہ اس معاملہ میں جا کر متعلقہ موقع دیکھ کر فیصلہ کرو۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسئلے میں قاضی مقرر کرکے فرمایا کہ اس مقدمے میں فیصلہ کرو تو انہوں نے پوچھا کس اساس پر۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس شرط پر کہ اگر تم صحیح نتیجے پر پہنچ گئے تو دو ثواب ملیں گے۔ ایک تو رسائی کا، دوسرا عدل وانصاف کرنے کا۔اور اگر تم صحیح نتیجہ پر نہ پہنچ سکے اور اتفاقاً ناانصافی ہو گئی تو پھر ایک اجر ملے گا، تمہاری حسن نیت کی وجہ سے کہ تم نے انصاف کیا ہے، لیکن اس کے باوجود خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک اعلیٰ ترین عدالت کی تھی۔ آج بھی ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو بہت سے ممالک میں اپیلٹ اختیارات حاصل ہیں۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو اپلیٹ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو نبی اور سربراہ ریاست کے طور پر دو حیثیتیں تھیں۔ دونوں حیثیتوں میں حضور علیہ السلام کو آخری عدالت اپیل کا اختیار حاصل تھا۔ اس کے علاوہ حضور نے مختلف قبائل میں الگ الگ قاضی بھی مقرر فرمائے۔ بعض افراد کو معلم اور قاضی دونوں کی ذمہ داریاں دیں۔ چنانچہ مشہور حدیث کے مطابق حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو معلم اور قاضی بنا کر یمن بھیجا گیا۔

اس طرح سے مختلف قبائل میں جو قاضی مقرر تھے وہ فیصلہ کرتے تھے اور ان کا فیصلہ confirmation کے لیے بعض صورتوں میں مدینہ منورہ بھیجا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ

بھی ہوا کہ قاضی کو پتہ نہیں چلا کہ اس معاملہ میں صحیح حکم کیا ہے، یا ان کو تامل ہوا تو انہوں نے توثیق کے لیے اپنا فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج دیا۔ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از خود suo moto کاروائی کیا کرتے تھے اور خود ہدایت دیتے تھے کہ فلاں معاملے کا فیصلہ اس طرح کرو۔

حضرت عتاب اسید جو مکہ مکرمہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ان کے سامنے قبل از اسلام کے ایک سودی معاملہ سے متعلق دعویٰ کا مقدمہ آیا۔ مدعی کا دعویٰ تھا کہ یہ تو سود کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے اس لیے سود کی حرمت کے باوجود بھی مجھے اپنے سابقہ واجبات کو حاصل کرنے کا اختیار ہے۔ عتاب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھا اور تفصیل بتا کر حضور سے رہنمائی کی درخواست کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے دربار میں ریفرینس بھیجے جاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عدالتوں کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔

ایک بار ایک قبائلی سردار کا قتل ہو گیا۔ قاتلین نے دیت ادا کی اور اس کی اطلاع حضور کو دے دی گئی کہ دیت ادا کر دی گئی ہے۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ پتہ نہیں اس مقتول کی بیوہ کو دیت میں حصہ دیا گیا ہے یا نہیں۔ اس خیال کی بنیاد پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علاقہ کے گورنر کے نام ایک نامہ مبارک لکھا کہ فلاں مقتول کی دیت اور ترکہ میں اس کی بیوہ کو اس کا حصہ دلایا جائے اور مجھے اطلاع دی جائے کہ یہ کام ہو گیا یا نہیں۔ اس طرح سے حضور نے ایک موثر اور مرکزیت کا حامل صیغہ عدالت قائم فرمایا۔

بہر حال عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عدلیہ کا اس طرح نظام قائم تھا کہ اگر کوئی فتویٰ لیتے یا فیصلہ کرتے تو پہلے اپنے قبیلے کے سردار سے رجوع کرتے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، ایک ہی دن میں فیصلہ ہوتا اور پھر نافذ بھی ہوتا۔ اس کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی ۔ فیصلہ میں کوئی دشواری بھی نہ ہوتی تھی، بلکہ ہر فرد انصاف اور فیصلہ کے لیے افسر عدالت، قاضی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت میں حاضر ہوتا اور فیصلہ اور انصاف

حاصل کرتا۔ اگر کوئی دشواری یا ظلم کا خدشہ ہوتا تو شکایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش کرتے اور فیصلہ پاتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور قاضی کے جو فیصلے کئے وہ الگ سے جمع کئے گئے ہیں۔ اقضیۃ الرسول کے نام سے ایک قدیم ترین کتاب ہے جو اسپین کے ایک بزرگ امام محمد بن الفرج الاندلسی نے لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی دربار رسول کے فیصلے کے نام سے ملتا ہے۔

امام ابو بکر بن ابی شیبہ مشہور محدث ہیں، امام ابو داؤد اور امام ترمذی کے اساتذہ میں سے ہیں۔ مسند امام ابن ابی شیبہ ان کی حدیث کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ انہوں نے بھی اقضیۃ الرسول پر ایک کتاب لکھی تھی۔ کئی کتابیں اور بھی اس موضوع پر ملتی ہیں۔ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے فیصلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ہمارے بر صغیر کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے بھی ایک کتاب اسی موضوع پر لکھی ہے۔ پاکستان میں حال ہی میں اسلامک انٹر نیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے سابق ڈاریکٹر جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان کی رہنمائی اور تعاون سے ایک کتاب دس بارہ جلدوں میں تیار ہو رہی ہے، اس کی پہلی جلد چھپی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کئے ہوئے تمام فیصلے اردو، انگریزی اور عربی تینوں زبانوں میں جمع کئے گئے ہیں۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے جن لوگوں کو قاضی مقرر فرمایا ان میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان کو مدینہ کا قاضی مقرر فرمایا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی موجودگی میں مدینہ میں مقدمات کے فیصلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کرتے تھے۔ یمن کے ایک علاقے میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرے علاقے میں حضرت معاذ بن جبل کو بطور قاضی بھیجا گیا تھا۔

شعبہ احتساب یا دیوان مظالم:

اس شعبے کا مقصد ، سرکاری ، عدالتی افسر وغیرہ کی زیادتیوں کا خبر لینا تھا۔آج Ombudsmann کا ادارہ موجود ہے۔اومبڈزمین کے ادارہ کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تصور سویڈن سے آیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔اس ادارہ کا آغاز سویڈن میں نہیں، بلکہ مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔ یہ ادارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا اور حضرت عمر فاروق نے اس کو دیوان مظالم کے نام سے ترقی دی۔ دیوان مظالم در اصل ایک اعلیٰ سرکاری عدالت تھی جو اعلیٰ سرکاری حکام اور با اثر لوگوں کی زیادتیوں اور مظالم کے خلاف شہریوں کے شکایات سنا کرتی تھی۔ حضور کے زمانے میں اس کا بندوبست بعض علاقوں میں کیا گیا تھا۔ حضرت عمر فاروق نے اس کو باقاعدہ شکل دی۔اس کے بعد دنیائے اسلام کے بیشتر مسلم ممالک میں یہ ادارہ قائم رہا۔ اسپین سے اس کو یورپیوں نے سیکھا۔ وہاں سے بعض پادری غرناطہ اور قرطبہ کی درسگاہوں میں اس ادارہ کے بارے میں واقفیت حاصل کرکے گئے۔ انگلستان میں پارلیمنٹری کمیشن اور سویڈن میں اومبڈزمین کے نام سے یہ ادارہ بنایا گیا۔ اس وقت دیوان مظالم کے نام سے یہ ادارہ صرف سعودی عرب میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں یہ ادارہ چودہ سو سال سے مسلسل قائم ہے اور کسی نہ کسی حد تک اسی انداز میں کام کرتا ہے جس انداز میں ماضی میں کام کرتا تھا۔

یہ صیغہ احتساب بھی اسی زمانے میں قائم ہوا تھا جس کو ہمارے صوبہ سرحد میں حسبہ کے نام سے قائم کرنے کی نیم دلانہ کوشش کی گئی۔ جس کو ہمارے اخبار والے حسبہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ حسبہ نہیں ہے، بلکہ ح کے زیر سے حسبہ ہے۔ یہ احتساب سے متعلق ایک ایسا نیم عدالتی ادارہ ہے جو اس کام کے لیے قائم کیا جاتا تھا کہ عام معاشرتی اخلاق کا تحفظ کرے اور اسلام کے معاشرتی اخلاق کے بارے میں نگرانی اور دیکھ بھال کی ذمہ داریاں انجام دے۔ یہ ادارہ بھی حضور نے قائم فرمایا تھا۔ یہ وہ عدالتی ادارے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائے۔

ریاست مدینہ کا دفاعی نظام

شعبہ وزارت کے ساتھ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وزارت دفاع بھی تھی۔ عسکریات کا شعبہ تھا۔ اس بارے میں کچھ لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کی ضرورت محسوس کرتے تو ایک ہجوم جمع ہو جاتا تھا اور چل پڑتا تھا جبکہ ایسا نہیں تھا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولین فرصت میں جو کام کئے ان میں ایک مردم شماری کا کام تھا۔ مردم شماری میں تمام بالغ مسلم خواتین اور حضرات کے نام لکھے گئے۔ پھر جب کوئی غزوہ یا دستہ بھیجا جاتا تھا تو شرکاء کے نام باقاعدہ لکھے جاتے تھے اور فہرست بنتی تھی۔ اس کا ریکارڈ بنتا تھا، جس کا ایک نقل مرکز میں ہوتی تھی، ظاہر ہے کوئی جگہ ہو گی جہاں پر یہ ریکارڈ رکھا جاتا رہا ہو گا۔ کچھ صحابہ کرام اس کے نگران اور منتظم بھی ہوتے ہوں گے۔ اس دستاویز کی ایک نقل دستہ کے کمانڈر کے پاس ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک تشریف لے گئے تو ۳۰ ہزار صحابہ کرامؓ ساتھ تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار، حنین اور طائف میں ۱۲ ہزار تھے۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ دس بارہ ہزار افراد کا ہجوم بغیر کسی ترتیب کے ساتھ ہو جاتا ہو۔ یہ سب کام ایک ترتیب کے مطابق ہوتا تھا، دستے ہوتے تھے۔ ہر دستے کا الگ کمانڈر ہوتا تھا۔ الگ پرچم اور پاس ورڈ ہوتا تھا۔ فہرست مرتب ہوتی تھی۔ کئی اور مقامات پر بھی ان نقلوں کو محفوظ رکھا جاتا تھا۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کسی نے کہا کہ میرا نام فلاں فلاں غزوے میں لکھا جا چکا ہے: اِكْتَتَبْتُ فِي غَزْوَةِ كَذَا وَكَذَا۔

ایک نوجوان نے آکر کہا کہ یا رسول اللہ میری نئی نئی شادی ہوئی ہے، میری بیوی کہتی ہے کہ میں اسے پہلے حج کرادوں، جبکہ میں فلاں غزوہ میں لکھا جا چکا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ غزوہ سے چلے جاؤ اور بیوی کو حج کراو۔ ان کی تسلی نہیں ہوئی ہو گی، بھیس بدل کر دوبارہ حاضر ہوئے اور وہی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ بیوی کو حج کے لیے لے

جائو۔ تیسری مرتبہ جب اسی طرح کیا تو حضور نے پہلے ان کے کندھے پر تھپکی دی اور پھر فرمایا کہ پہلے بیوی کو حج کرواؤ اس کے بعد غزوہ کرنا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر غزوہ میں جانے والے شرکا کی ایک فہرست بنتی تھی۔ اس کے مطابق لوگ جاتے تھے اور اس کے مطابق ساری کاروائی ہوتی تھی۔

دفاع کے لیے جدید اسلحہ کا حصول:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو طرح کے ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔ کچھ ہتھیار تو وہ تھے جو ہر فرد کی ذاتی ملکیت ہوا کرتے تھے، چونکہ عرب میں قبائلی معاشرہ تھا جیسے ہمارے ہاں کے قبائلی معاشرہ میں بھی ہر فرد کا ذاتی اسلحہ الگ ہوتا ہے تو عرب میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس ذاتی اور انفرادی اسلحہ کے علاوہ کچھ بڑا اسلحہ تھا جو ریاست کی ملکیت ہوتی تھی۔

چنانچہ عرب میں یمن کی طرح جو علاقے زیادہ متمدن اور بڑے تھے وہاں دو بڑے ہتھیار بھی استعمال ہوتے تھے۔ ایک منجنیق اور دوسرا دبابہ کہلاتا تھا۔ میں نے ایک جگہ منجنیق کی تصویر دیکھی ہے اس کو آپ موجودہ دور کے ٹینک یا توپ کا ایک ابتدائی ماڈل کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ فوج کے راستہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ اس کی عام صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک بہت بڑا وزنی پتھر لے کر قلعوں کی دیواریں توڑنے کے لیے دور سے پھینکا جاتا تھا تاکہ قلعہ بند دشمن کے قلعہ کی دیوار توڑ کر اندر داخل ہو جائے یہ بہت سادہ سی چیز ہوتی تھی۔ اس میں ایک بڑے پتھر کو رسیوں اور بانسوں کے زور سے بہت قوت کے ساتھ دور تک مارا جا سکتا تھا۔ اس سے قلعہ کی دیوار ٹوٹ جایا کرتی تھی۔ یہ چیز عرب کے شہروں یعنی مکہ، طائف، مدینہ وغیرہ میں نہیں تھی، یمن میں ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صحابہ کرام کو یمن سے منجنیق چلانے کا طریقہ سیکھنے اور ایک منجنیق خرید کرلانے کے لیے بھیجا۔ وہ اس کو بنانے اور چلانے کی تربیت بھی حاصل کرکے واپس آئے۔ غیر مسلموں سے بڑے ہتھیاروں کے بنانے کی تربیت حاصل کرنا، یہ صحابہ کرام کی سنت ہے۔ صحابہ کرام یمن سے

منجنیق بھی لائے اور ساتھ میں اس کو چلانے کی تربیت بھی حاصل کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو طائف کی فتح میں استعمال بھی کیا۔

دوسرا اسلحہ دبابہ تھا۔ آج کل عربی میں ٹینک کو دبابہ کہتے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں دبابہ سے مراد ایک ایسی سواری تھی جس کو لکڑی یا لوہے کی چھت کے ذریعے اوپر سے ڈھانپ دیا جاتا تھا اور اس پر کوئی ایسی چیز لگا لیا کرتے تھے جس پر تیر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب قلعہ میں داخلہ کے لیے یا کسی اور طریقے سے دشمن کے قریب جانا ہوتا تھا تو دبابہ سے دشمن پر تیروں کی بارش ہوتی تھی اور دبابہ خود تیر اندازوں سے محفوظ رہتا۔ دبابے میں تین چار سپاہی بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ قلعہ کے قریب جا کر اس کا دروازہ یا دیوار توڑنے کی کوشش کرتے۔ آپ اس دور کے دبابہ کو آج کی بکتر بند گاڑی کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل ابن ہشام نے بھی لکھی ہے اور الروض الانف نے بھی لکھی ہے۔

شعبہ سراغ رسانی یا انٹیلی جنس:

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سراغ رسانی کا شعبہ بھی قائم فرمایا۔ اس کی دو شکلیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ بعض افراد مستقل طور پر بعض قبائل میں اس کام پر مامور تھے کہ وہ اس قبیلہ میں اسلام کے خلاف جو بھی تیاریاں ہو رہی ہوں اس کے بارے میں معلومات سے اسلامی ریاست کو مطلع کیا کریں۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں کئی لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ قریش مکہ کی تیاریوں سے حضور کو مطلع فرماتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض خاص مواقع پر خاص لوگ بھیجے جاتے تھے کہ وہ جا کر پتہ چلائیں کہ دشمن کیا کر رہا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔ اس کی درجنوں مثالیں ہیں اور کتاب المغازی میں واقدی نے تقریباً ہر صفحہ پر ایک آدھ بات ایسی کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سراغ رسانی کا ایک منظّم اور موثر شعبہ موجود تھا۔

دیوان:

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں دیوان قائم ہوا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری خزانے سے سپاہیوں کو پینشن (تنخواہ) دی جاتی تھی۔ اس شرط پر جو چوبیس گھنٹے اس غرض کے لیے تیار رہے کہ جب بھی حکومت، جس وقت انھیں بلائیں تو وہ گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر فوج میں شامل ہو کر فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں۔

اس دیوان کے قیام کی نسبت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف کی جاتی ہے، لیکن اصل میں اس دیوان کا آغاز عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا اور پھر اس کو مزید فعال بنانے میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اہم کردار ہے۔ چنانچہ شرح سِیَرِ کَبِیر میں ہے کہ ان (سیکٹریٹ کے) کاتبوں میں ایک عہدہ اس غرض کے لیے بھی تھا کہ ان لوگوں کی فہرست تیار کی جائے جو نہ صرف جنگ کی صلاحیت رکھتے ہوں، بلکہ اس بات پر وہ آمادہ بھی ہو کہ جب انھیں بلایا جائے تو وہ گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر جہادی مہم پر روانگی کے لیے تیار ہوں۔ تو ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی بیت المال) کی طرف سے روزینہ یعنی پینشن ملا کرتی تھی۔

رضاکارانہ فورس:

دفاع کے سلسلے میں صفہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ صفہ کا تعلق بیک وقت تعلیم سے بھی تھا اور دفاع یعنی فوج سے بھی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی دشمن کو سزا دینے یا ان کا تعاقب کرنے کی اطلاع ملتی تاکہ فوراً اس کے لیے کوئی دستہ، کچھ فوج روانہ کیا جائے مثلاً ریاست مدینہ پر کسی نے چھاپہ مارا وغیرہ۔ اس ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اصحاب صفہ کو کام میں لایا جاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت حال میں پہلے صفہ کا نگران بلاتے کہ مجھے فوراً ہنگامی طور پر اتنے لوگوں کی ضرورت ہے۔

وہ نگران اندر جا کر اعلان کرتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فوراً ایک مہم کے لیے اتنے افراد کی ضرورت ہے، کون رضاکارانہ طور پر شامل ہونا چاہے گا، تو اس طرح چند

منٹوں میں چھوٹا موٹا دستہ وہاں سے تیار ہو جاتا۔ کسی بھی وقت دن یا رات کو یہاں سے وہ ضرورت پوری کی جا سکتی تھی۔ صفہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس مقصد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا اور یہاں پر اسلامی فوج کے یہ افراد آرام بھی کیا کرتے تھے اور اگر کسی بڑی مہم پر جانا ہوتا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں کسی خطبے یا نماز کے بعد یا غیر معمولی اجتماع کروا کر فرماتے کہ اتنے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ لوگ اپنے آپ کو پیش کرتے اور تیاری کرتے۔ تو ان لوگوں کے نام اور پتہ لکھ لیا جاتا اور پھر وقت اور جگہ بتایا جاتا کہ فلاں دن فلاں وقت فلاں جگہ اپنی سواری اور اسلحے کے ساتھ جمع ہو جاؤ۔

فوجی ٹریننگ اور تیاری:

اسلامی ریاست کے لیے فوج کا قیام، ان کے انتظامات اور فوجیوں کی تربیت وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے اور خود نگرانی کرتے۔ فوجی نظام کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نشانہ بازی، ورزش، گھوڑا دوڑ وغیرہ کی ترغیب دیتے، صحابہ کرام کے درمیان دوڑ کرواتے، کشتی کے مقابلے اپنے سامنے کرواتے اور خود وہاں جا کر انعامات بھی دیتے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی ضروریات کا ذخیرہ یعنی اسلحہ بھی جمع کروانا شروع کیا مثلاً ہتھیار خریدنا، گھوڑے، اونٹ خریدنا، ان کو سرکاری چراگاہ میں رکھنا تاکہ موقع پر سپاہیوں کے پاس ضرورت کی چیزیں ناکافی ہو تو حکومت کی طرف سے بھی ان کو مدد دی جائے، کیونکہ انتظامات کے ناکافی ہونے کی وجہ سے حتی الوسع فوج کو تکلیف اور ناکامی نہ ہو۔

پرامن فتوحات اور فوجی کاروائیاں:

ریاست مدینہ اور اس کا نظام مملکت جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شروع ہوا، ابتدا میں یہ مملکت پورے مدینے میں نہیں تھی، بلکہ شہر میں قائم کی گئی تھی پھر بہت تیزی کے ساتھ اس کی توسیع ہو گئی۔ توسیع کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ 10 سال بعد نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے وقت اس مملکت کا رقبہ تقریباً 3 ملین یعنی 30 لاکھ مربع کلومیٹر تھا۔

ریاست مدینہ میں یہ تیزی سے توسیع کیسے ہوا، اس کے لیے کون سے طریقے اختیار کیے گئے اور اس کے لیے کتنی غزوات لڑی گئیں۔ اس میں کتنے لوگ شامل ہوئے، کس جنگ میں ہمارے کتنے شہید ہوئے اور دشمن کے کتنے مارے گئے۔ یہ تمام تفصیلات احادیث اور کتب سیرت و تاریخ میں موجود ہیں۔ ان سب کا مختصر الفاظ میں خاکہ یہ ہے کہ 10 سال میں 3 ملین رقبہ فتح کرنے کے لیے دشمن کے مقتولوں کی تعداد ہر مہینہ کے حساب سے دو افراد ہوتے تھے، جبکہ مسلمان شہداء کی تعداد اس سے بھی کم ہے۔ سب سے زیادہ نقصان جو ہوا وہ مسلمانوں کا جنگ احد میں 70 آدمی شہید ہوئے اور اسی طرح دشمن کے جنگ بدر میں 70 مارے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں انسانی جان اور خون کی عزت کتنی تھی۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اسوہ حسنہ کے ذریعے اپنے بعد کے آنے والوں حکمرانوں اور فاتحوں کو یہ بتاتے ہیں کہ اعلاء کلمتہ اللہ اور اسلامی ملک کی حفاظت اور دفاع کے لیے دشمن سے مقابلہ ضرور کرو، دشمن کو شکست ضرور دو، لیکن لوگوں کا بے جا خون نہ بہاؤ۔

ریاست مدینہ کا معاشی نظام

مدینہ منورہ اس اعتبار سے پورے جزیرہ عرب میں نمایاں تھا کہ وہاں تجارت اور زراعت دونوں کے مراکز تھے۔ طائف میں زیادہ تر زراعت ہوتی تھی تجارت کم تھی۔ مکہ مکرمہ میں صرف تجارت ہوتی تھی زراعت نہیں تھی۔ مدینہ منورہ میں تجارت اور زراعت دونوں ہوتی تھیں۔ مدینہ منورہ میں بہت سے باغات اور کھیت تھے۔ کھجور اور انگور کے علاوہ بھی بہت سی دوسری پیداوار ہوتی تھی۔ تجارت میں اگرچہ اب مسلمان بھی شریک تھے، لیکن زیادہ تر تجارت اب بھی یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔

بنو نضیر قبا کے قرب و جوار میں آباد تھے۔ ان کے متعدد آطام تھے، ان کی آبادی چند ہزار افراد پر مشتمل تھی، زرعی زمینیں زیادہ تر انہی کی تھیں۔ مدینہ منورہ کی ذراعت کے بڑے حصہ پر وہی قابض تھے۔ یہودیوں کا طریقہ شروع سے یہی رہا ہے۔ مدینہ میں بھی یہی طریقہ رہا کہ تجارت اور کاروبار پر یہودی قابض تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے پاس وسائل کی کثرت اور بہتات تھی۔ اس دولت کی مدد سے ضرورت مندوں کو قرض دیا کرتے تھے۔ اس پر سود عائد کرتے تھے، سود در سود کی وجہ سے مقروض پھنس جاتا تھا تو قرض دار اس کی زمینیں رہن رکھ لیتا تھا۔ زمینیں رہن رکھنے کے باوجود جب مقروض قرض ادا نہ کر پاتا تو اس کی زمین ہتھیالی جاتی۔ اس طرح ایک ایک کرکے عربوں اور دوسرے مسلمانوں اور انصاریوں کی بہت سے زمینیں یہودیوں نے ہتھیار کھی تھیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو ان میں سے بہت سے عرب قبائل کی زمینیں یا تو یہودیوں کے پاس رہن تھیں یا وہ ان کو پہلے ہی اپنی ملکیت قرار دے کر قبضہ کر چکے تھے۔

یہودی قبیلہ بنو قینقاع مسجد نبوی کے قریب ترین خطہ میں رہنے والا قبیلہ تھا۔ یہ لوگ تاجر تھے، اس کے ساتھ ساتھ دستکاری یعنی ہینڈی کرافٹ کے بھی ماہر تھے۔ سونے،

لوہے اور بڑھئی کا کاروبار سب بنو قینقاع ہی کے یہودی کرتے تھے۔ اس طرح سے مدینہ منورہ کے پورے بازار اور تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ مدینہ منورہ کا سب سے بڑا بازار بھی انہی کا تھا، یہ لوگ تعداد میں ساڑھے تین چار ہزار کے قریب تھے۔ ان میں سات سو قابل جنگ مرد اور باقی بوڑھے ، عورتیں اور بچے تھے ۔ جہاں چھوٹے چھوٹے بازار لگتے تھے ،وہاں بھی انہی کا سازوسامان آیا کرتا تھا۔ بنو قینقاع کا ایک قبیلہ ایک الگ گاؤں میں آباد تھا۔ یہ سارا قبیلہ پیشہ کے اعتبار سے سنار تھا۔ اس بستی میں تین سو سنار تھے جو نہ صرف مدینہ منورہ بلکہ قرب و جوار میں بھی اپنی مصنوعات کو فروخت کیا کرتے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لائے تو آپ نے ایک ایک کر کے ان میں سے ہر چیز کا جائزہ لیا۔ جو چیز اسلام کے نقطہ نظر سے قابل قبول تھی یا غلط نہیں تھی، اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری رہنے دیا اور اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔

اسلام کا معاملات کے بارے میں اصول:

یہ اسلام کی حکمتِ تشریع کا ایک بنیادی اصول ہے کہ معاملات اور تجارت کے ابواب میں اصل چیز حلت ہے، حرمت نہیں۔ بالفاظ دیگر اصول یہ ہے کہ جو کاروبار لوگ کر رہے ہیں اگر وہ شریعت کے کسی حکم سے متعارض نہیں ہے تو وہ کاروبار جائز ہے۔ شریعت نے بعض احکام مثبت طور پر دیئے۔ قرآن پاک کی سورۃ بقرہ میں جو ہجرت کے ایک دو سال بعد نازل ہوئی اس میں تجارت کے بارے میں بعض بنیادی احکام دیئے گئے۔ یہ کہا گیا کہ تجارت وہ ہے جو آپس کی رضامندی سے ہو، جائز معاملات میں ہو، اس میں کسی کو دھوکہ نہ دیا گیا ہو، تراضی سے ہو، ایک دوسرے کے طیب نفس سے ایک دوسرے کے مال کا تبادلہ کیا گیا ہو۔ جو تجارت ان ہدایات کے مطابق تھی وہ جائز قرار پائی اور جو ان ہدایات کے خلاف تھی یا ان میں ان ہدایت کی خلاف ورزی کا امکان تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادی۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ منفی چیزوں کی صراحت بھی کر دی گئی کہ یہ چیزیں ناجائز

ہیں اور تجارت اور کاروبار سے ان کو ایک ایک کرکے ختم کیا جائے۔ اس لیے عرب میں تجارت کی جتنی شکلیں تھیں ان میں سے ایک ایک کرکے کچھ شکلیں جو خالص منفی اور غیر منصفانہ تھیں وہ ناجائز قرار پائیں اور بہت سی رائج الوقت شکلوں کو جزوی اصلاحات کے ساتھ جائز قرار دے دیا گیا۔

مدینہ کے ذرائع معاش:

مدینہ منورہ کی بڑی بڑی پیداوار کھجور، جو، انگور، انجیر کی تھی اور کچھ پھل جن میں انار اور کیلا بہت نمایاں ہیں، کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ گندم پیدا ہوتا تھا لیکن تھوڑا تھا۔ عام طور پر لوگوں کی غذا جو ہوا کرتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو مشہور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خاندان نے کبھی مسلسل کئی دن تک گندم استعمال نہیں کیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی تھی گندم مدینہ منورہ کی بڑی پیداوار نہیں تھی۔ گندم کا بیشتر حصہ خیبر سے لایا جاتا تھا۔ یہ دور سے لانے کی وجہ سے مہنگا بھی تھا اور کم بھی تھا، مصنوعات میں زیادہ تر کپڑا، ہتھیار، لکڑی کا سامان شامل تھا۔ انگور کی پیداوار کی وجہ سے شراب کی پیداوار بھی تھی۔ اکثر شراب خانے یہودیوں کے تھے، وہ خود بھی شراب کا کاروبار کرتے تھے اور اِن سے لے کر دوسرے لوگ بھی قرب و جوار میں شراب کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ جب شراب حرام قرار پائی تو مہاجرین اور انصار دونوں میں شراب کا کاروبار کرنے والوں نے شراب کے کاروبار سے ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا۔ چونکہ مدینہ منورہ میں مارکیٹ ختم ہو گئی اس لیے غیر مسلموں نے بھی ایک ایک کرکے شراب کا کاروبار ختم کر دیا۔

مدینہ منورہ میں جو افراد زمینوں کے مالکان تھے ان میں سے کچھ لوگ بڑے بڑے قطعوں کے اور بعض چھوٹے چھوٹے قطعوں کے مالکان تھے۔ چھوٹے قطعوں کے مالکان اپنی زمینوں پر خود کام کرتے تھے جبکہ بڑی زمینوں کے مالکان مختلف طریقوں سے اپنی زمینوں پر کام کرایا کرتے تھے۔ کچھ لوگ مزدوری دے کر کام کراتے تھے۔ کچھ لوگ مزارعت اور محاقلہ کی

بنیاد پر کام کراتے تھے۔ یہ مختلف طریقے عرب میں رائج تھے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مزارعت کی بعض شکلوں کو ناجائز قرار دیا اور بعض کی اجازت دی۔ جن شکلوں میں سود، دھوکہ، استحصال یا اس طرح کی کوئی اور خرابی پائی جاتی تھی، ان شکلوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجائز قرار دیا اور جن شکلوں میں استحصال یا ربٰو نہیں پایا جاتا تھا ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ مدینہ منورہ کی زمین اکثر بارانی تھی اس لیے سال میں ایک ہی فصل ہوا کرتی تھی۔ کہیں کہیں کنویں بھی تھے جن سے رہٹ اور اونٹ کے ذریعے پانی نکالا جاتا تھا۔ جن باغات میں کنویں تھے وہاں سال میں دو فصلیں بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اکثر باغات میں سالانہ ایک ہی فصل ہوتی تھی۔

دستکاری میں گھریلو دستکاری بھی تھی اور اجتماعی دستکاری بھی تھی۔ گھریلوں دستکاری میں عموماً کپڑے، سوت کاتنے، دھاگہ بنانے کا کاروبار ہوتا تھا۔ جو بڑے کاروبار تھے اور جس میں ایک سے زائد لوگ کام کرتے تھے جس کو آپ فیکٹری یا کارخانہ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں زراعت، نجاری اور لوہاری کے آلات بنائے جاتے تھے۔ یہ سرگرمی عموماً بنو قنیقاع کے ہاتھ میں تھی۔ قرب و جوار کی آبادیاں زرعی آبادیاں تھیں اس لیے وہاں آلات زراعت کے کام کی خاصی گنجائش تھی۔ مدینہ منورہ کے تاجر ایمپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی کرتے تھے۔ شام سے کپڑا اور استعمال کی دیگر اشیاء منگوایا کرتے تھے۔ گندم کا بیشتر حصہ اردن سے آیا کرتا تھا۔ کاروبار میں یہودی بھی پیش پیش رہتے تھے اور شام کے مختلف علاقوں میں ان کی تجارتی کوٹھیاں اور مراکز تھے جہاں سے وہ ایمپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ بنو نضیر کے یہودی اس کام میں بڑے نمایاں تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا، اور یہ ہجرت کے فوراً بعد کی بات ہے ہجرت کے چند مہینے یا ایک ڈیڑھ سال کے بعد، کہ مسلمان بڑی تنگ دستی کے عالم میں تھے۔ یہودیوں کا ایک بڑا تجارتی قافلہ آیا۔ اس میں خوشبوئیں، جواہرات اور سمندری سامان غالباً موتی وغیرہ مدینہ کے بازار

میں آکر اترا۔ مسلمان خواتین اور نوجوانوں نے حسرت کی ایک نظر سے ان سب چیزوں کو دیکھا اور دل میں محسوس کیا کہ تمام مال و دولت یہودیوں کے پاس ہے۔ مسلمانوں کے پاس کچھ نہیں۔اس وقت مسلمانوں کی تسلی کے لیے قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِنْهُمْ

" ہم نے آپ کو قرآن اور سات مثانی عطاء کئے ہیں جو بہت بڑی نعمت ہے۔ ان کی اسی عارضی نعمت پر آپ زیادہ دل میلانہ کریں۔ یہ ایک وقتی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر ان کو دی ہے"۔

مدینہ میں اسلامی معیشت کا قیام:

غرض یہ تجارت بیشتر یہودیوں کی تجارت تھی، جس پر ان کا قبضہ تھا۔ انصار یعنی اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ ان کے مقروض تھے۔ اور کی زمینیں ایک ایک کرکے یہودیوں کے قبضے میں جا رہی تھیں۔ اس صورت حال پر مہاجرین کے آنے سے بہت فرق پڑا۔ مہاجرین تجارت کے بڑے ماہر تھے۔ مکہ مکرمہ میں اصل کام تجارت تھا۔ مہاجرین میں بڑے بڑے نامی گرامی تاجر تھے۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ ، سیدنا عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ ، یہ بڑے بڑے صحابہ تھے اور تجارت کے فن میں طاق تھے۔ جب انہوں نے مدینہ منورہ کے بازاروں میں تجارت شروع کی تو یہودیوں کا زور بازار پر سے کم ہوتا چلا گیا اور ان کی بالادستی متاثر ہوئی۔

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بنو قینقاع کے بازار میں ہی کاروبار شروع کیا تھا۔ وہاں کے تاجروں نے بازار پر اپنی اجارہ داری بنائی ہوئی تھی۔ ایک شخص ابو رافع تھا، وہ تاجر حجاز کہلاتا تھا۔، پورے حجاز کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ بنو قینقاع کے پورے بازار بلکہ مدینہ منورہ کے بازار پر اس کا کنٹرول تھا۔ جو قیمت وہ قرار دیتا تھا وہ قیمت بازار کی ہوتی تھی۔ سب یہودی

تاجر متحد ہو کر اس کے فیصلوں کی پابندی کرتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ ایکا کرکے کسی غیر یہودی تاجر کو بازار میں پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ اس نے دو پیمانے بنا رکھے تھے، ایک پیمانہ دینے کے لیے اور ایک لینے کے لیے ہوتا تھا۔ اسلام نے بعد میں دو پیمانے رکھنے کی ممانعت کر دی۔

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پہلے تاجر تھے جنہوں نے ابو رافع تاجر حجاز کی اس بالادستی کو ختم کر دیا۔ اور ایک ایک کرکے اس کے غلط تجارتی طریقوں کو ختم کیا اور اس کے کنٹرول کو کمزور کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معیشت اور تجارت کے بارے میں ایک بڑا اہم فیصلہ یہ کیا کہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد ایک نیا بازار قائم کیا جو مسجد نبوی کے قریب ہی تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے لیے ایک متبادل بازار قائم ہو جائے اور یہودیوں کی شرارتوں اور اجارہ داری سے مسلمانوں کو نجات مل جائے اور جہاں ان کا اپنا نظام معیشت نافذ اور جاری ہو۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تو دنیاوی اعتبار سے بھی بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، بڑی محترم شخصیت تھے۔ اللہ نے وسائل بھی دیئے تھے اور تجارت کی مہارت عطا کی تھی۔

ان کو شکست دینا اور ان کے کاروبار کو خراب کرنا تو یہودیوں کے لیے ممکن نہیں تھا، لیکن چھوٹے مسلمان تاجروں کو یا ایسے لوگوں کو، جن کا رسوخ کم تھا، ان کو یہودی تاجر تنگ کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر اپنے مسلمان خریداروں کو بھی یہودی دکاندار تنگ کیا کرتے تھے۔ ایک مسلمان خاتون کی بے حرمتی کا مشہور واقعہ بھی اسی پس منظر میں ہوا جس کی وجہ سے غزوہ بنو قنیقاع پیش آیا۔

ان ساری چیزوں کا سد باب کرنے کے لیے اور ایک متبادل تجارتی پلیٹ فارم قائم کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بازار قائم کیا جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تمہارا اپنا بازار ہے۔ اس میں کوئی بھی تمہارے ساتھ زیادتی یا کمی نہیں کرے گا۔ یہاں تم سے کوئی ظالمانہ ٹیکس نہیں لے گا۔ یہودی اپنے بازار میں بیٹھنے

والے مسلمانوں سے غیر ضروری ٹیکس بھی لیا کرتے تھے اور ان پر طرح طرح کے مالی تاوان اور بوجھ ڈالا کرتے تھے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے بازار میں کاروبار کرنے والے مسلمان تاجروں کے لیے ٹیکس ریٹ کا اعلان کیا کہ کوئی اضافی بوجھ تم پر نہیں ڈالا جائے گا۔ مزید فرمایا کہ جو شخص ہمارے اس بازار میں مال لا کر بیچے گا وہ اسی اجر کا مستحق ہو گا جس کا جہاد کرنے والا مجاہد مستحق ہے۔

اَلْجَالِبُ اِلٰی سُوْقِنَا کَالْمُجَاهِدِ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ۔

جو ہمارے اس بازار میں مال لے کر آئے گا وہ اسی طرح کے اجر کا مستحق ہو گا جس طرح کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ جس طرح اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، مسلمانوں کی آزادی کی ضمانت فراہم کرتا ہے اسی طرح جو مسلمانوں کے بازار کو کامیاب بناتا ہے وہ مسلمانوں کی معاشی آزادی کو یقینی بناتا ہے۔ مسلمانوں اور امت مسلمہ کی آزادی کو یقینی بنانے والا کوئی بھی عمل جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے۔ اس کے برعکس آپ نے فرمایا کہ ہمارے اس بازار میں کوئی شخص اگر ذخیرہ اندوزی کرے گا تو اس کو اتنا ہی مجرم سمجھا جائے گا جس طرح کہ کتاب اللہ میں الحاد کرنے والا، یعنی کتاب اللہ کی معانی میں غتربود کرنے والا یا کتاب اللہ کے معانی کو غلط بیان کرنے والا۔

مدینہ میں اس زمانے کے بہت سے دوسرے علاقوں کی طرح بارٹر کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ لوگ ایک چیز دے کر دوسری چیز لے لیا کرتے تھے۔ ابتدائی معیشت میں ہر جگہ بارٹر کا سسٹم ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ میں بھی تھا۔ یہودیوں نے اس بارٹر سسٹم کو بھی اپنی بالادستی کا اور اپنے معاشی کنٹرول کو مضبوط کرنے کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ چونکہ زرعی پیداوار پر قبضہ اور کنٹرول عموماً یہودیوں ہی کا ہوتا تھا۔ صنعت اور تجارت یہودیوں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے جب فصل کٹنے میں ابھی کافی وقت ہوتا تھا لوگوں کو چیز دیتے وقت کہتے تھے کہ یہ اچھی چیز ہے اور جب لوگوں کی پیداوار وصول ہو جاتی تھی اور وہ قرض وصول کرنے آتے تو کہتے کہ تمہاری

پیداوار گھٹیا ہے اس لیے تمہیں زیادہ دینا پڑے گا۔ اپنی پیداوار کو اعلیٰ اور دوسروں کی پیداوار کو گھٹیا قرار دیتے تھے، اور مثلاً ایک کلو کے بدلے میں دو کلو لے لیا کرتے تھے۔ یہ بھی استحصال کا ایک طریقہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ربٰو کے احکام کے تحت کاروبار کی بہت سی شکلوں کو ناجائز قرار دیا تو آپ نے اس شکل کو بھی ناجائز قرار دیا۔ اس کو ربا الفضل کہا جاتا ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے جس میں چھ چیزوں کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ:

اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالفِضَّةُ بِالفِضَّةِ وَ الشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ وَ المِلحُ بِالمِلحِ وَ التَّمَرُ بِالتَّمَرِ وَ الحِنطَةُ بِالحِنطَةِ مَثَلاً بِمَثَلٍ يَدًا بِيَدٍ وَ الفَضلُ رِبٰو۔

یعنی سونا اور چاندی، جو، کھجور، گندم اور نمک کا جب باہمی لین دین کیا جائے تو دست بدست کیا جائے، فوراً دیں اور فوراً لیں اور برابر سرابر کی بنیاد پر لین دین کیا جائے۔ زیادتی ہو گی تو اس کو ربٰو سمجھا جائے گا۔

اس حکم نے دو اچھے نتائج پیدا کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے نتیجہ میں بارٹر کے کاروبار میں خود بخود کمی آئی اور زری معیشت یعنی مانیٹری اکانومی کو فروغ ہوا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ یہودیوں کے استحصال کا ایک بہت بڑا طریقہ ختم ہو گیا۔ اور وہ جس انداز سے مسلمان تاجروں اور ساہوکاروں کو نقصان پہنچا رہے تھے وہ سلسلہ رک گیا۔ یہ ربٰو کی وہ قسم ہے جس کو فقہا نے ربٰوالبیع یا ربٰوالفضل یا ربٰوالحدیث کے نام سے یاد کیا ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا الگ بازار قائم فرمایا تو اس کو اور آئندہ کی معاشیات کو صحیح خطوط پر قائم کرنے کے لیے آپ نے بعض ہدایات دیں جو ابھی تک اسلام کے معاشی نظام کا بنیادی ستون سمجھی جاتی ہیں۔ آپ نے یہ فرمایا کہ بازار میں جو لوگ کاروبار کریں، وہ آزادانہ رضامندی کے ساتھ کاروبار کریں اور کوئی بیرونی قوت ان کو کسی خاص انداز پر چلنے کے لیے مجبور نہ کرے۔ یعنی مصنوعی طور پر قیمتوں میں کمی بیشی نہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی نہ ہو اور کسی کو اپنا سامان بازار میں لانے سے روکا نہ جائے۔ اس زمانے میں

یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ یہودیوں کے بازار میں باہر سے جو لوگ آتے تھے۔ مثلاً مکہ مکرمہ میں چمڑے کی مصنوعات کا بڑا رواج تھا۔ وہاں سے کوئی تاجر اپنا چمڑہ فروخت کرنے کے لیے آیا۔ تو جب یہودی ساہو کاروں کو پتہ چلتا تھا کہ چمڑہ آرہا ہے تو یہودی ساہو کاروں کے نمائندے باہر سے آنے والے تاجر سے راستے ہی میں سارا ذخیرہ خرید لیتے تھے اور بازار تک اس کو آنے نہیں دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ یہ تاجر اگر خود بازار آئے تو اس کو قیمتوں کا پتہ چل جائے گا اور وہ اپنے مال کو بہتر قیمت پر بیچ سکے گا۔ اس سے روکنے کے لیے پہلے ہی جا کر اس کا مال خرید لیتے تھے اور پھر لا کر من مانی قیمتوں پر فروخت کرتے تھے۔ اس طرح ان کو ذخیرہ اندوزی کا موقع بھی ملتا تھا۔ قیمتوں کے تعین میں بھی اپنی مرضی چلاتے تھے۔ اور اس شخص کو جو اصل مال لے کر آیا ہے اس کو ایک معقول قیمت سے محروم کر دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی اور اس مداخلت کو ناجائز قرار دیا۔ حدیث میں کئی مواقع پر آیا ہے کہ:

نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَن تَلَقِّي الجَلَبِ

اس سے مراد یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مال کو بازار میں آنے سے پہلے ہی جا کر پونے داموں خرید لیا جائے، اس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی۔ تلقی جلب کے معاملہ کو آج کی معاشیات کے نظام میں کیسے بیان کیا جائے گا۔ اس کے لیے حکومت کو قواعد بنانے چاہئیں۔ سرکاری ریگولیٹری اداروں کو یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ مارکیٹ تک رسائی ہر شخص کو یکساں طور پر حاصل ہو۔ کوئی ایسا گروہ نہ ہو جو نئے آنے والوں کو مارکیٹ میں آنے سے روکے۔ اسی طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ، لغوی اعتبار سے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شہری آدمی دیہاتی کے لیے مال فروخت نہ کرے۔ یہ بھی تلقی جلب کی ایک شکل ہے۔ دیہات میں لوگ بہت سے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔ مثلاً اونٹ کے اون سے لوگ خیمے بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح سے خوراک کا بہت سا سامان بدووں کے ہاں تیار

ہوتا تھا۔ شہری لوگ جا کر وہاں سے بہت معمولی قیمت پر سامان خرید لیا کرتے تھے۔ آج بھی ہمارے دیہاتوں میں یہ ظلم بہت ہوتا ہے۔ دیہاتوں میں اونے پونے داموں چیز خرید کر بڑے شہروں میں بہت اچھی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ حکم ایسے ہی معاملہ کے لیے ہے کہ کوئی شہری آدمی دیہاتوں سے چیز معقول قیمت سے کم پر خرید کر مہنگی فروخت نہ کرے۔

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

نَھٰی رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ بَیْعِ الْکَالِیِٔ بِالْکَالِیِٔ

یعنی ادھار کی خرید فروخت ادھار کے ساتھ درست نہیں ہے۔ آپ کا کسی کے ذمہ کوئی قرض ہے، اس شخص کی رقم کسی اور کے ذمہ واجب الادا ہے۔ ان دونوں رقموں کا آپس میں تبادلہ ہو جائے یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ کم از کم ایک طرف کی چیز نقد ہونی چاہیے اور اس کو موقع پر موجود ہونا چاہیے۔

ان ساری اصلاحات کو ایک ایک کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرمایا۔ پھر جب یہ اصلاحات نافذ ہو گئیں تو آپ نے بازاروں پر نگران مقرر فرمائے۔ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد ان کو وہاں بازار کی نگرانی کے لیے مقرر فرمایا تاکہ ان تمام شرائط اور قواعد کی پابندی کرائیں۔

اس زمانے میں ایک عام طریقہ یہ بھی تھا کہ ہر بااثر شخص یعنی کوئی قبائلی سردار یا چند افراد کا ایسا گروہ جن کے پاس اسلحہ، قوت، اور تعداد ہو، وہ جنگلات پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔ اپنے اثر و رسوخ کے زور پر چراگاہوں یا ایسے مقامات پر قبضہ کر لیا کرتے تھے جہاں پانی اور زراعت کی بہتات ہو اور اس کو اپنے جانوروں کے چرنے کے لیے خاص کر دیا کرتے تھے۔ اس جگہ کو حمیٰ کہا جاتا تھا۔ کہ فلاں سردار کی حمیٰ ہے۔ عربوں میں بہت پہلے سے یہ رواج تھا۔ اس پر جنگیں بھی ہوئیں۔ ایک مشہور جنگ جو، داحس اور غبراء کی جنگ کہلاتی ہے وہ بھی اس حمیٰ کی وجہ سے ہوئی۔ کسی سردار کے حمیٰ میں کسی کی اونٹنی چلی گئی۔ اس نے اس کو قتل کر دیا۔ اس کے جواب میں اس کے گھوڑے کو قتل کر دیا گیا۔ پھر دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ شروع ہو

گئی جو کئی پشتوں تک جاری رہی۔ اس جنگ کی داستان عربی زبان کے ادب میں تفصیل سے ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حمیٰ کو ختم کرکے حکم دے دیا کہ:

لَاحِمٰی اِلَّا اللہُ وَ رَسُوْلُہٗ

حمیٰ قائم کرنے کا اختیار صرف حکومت یا ریاست کو ہے۔ حکومت اپنے سرکاری جانوروں، صدقہ کے جانوروں کے لیے یا فوجی جانوروں کے لیے حمیٰ یعنی سرکاری چراگاہ مقرر کر سکتی ہے۔ باقی کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ پبلک کی زمین کو اپنے لیے خاص کر لے اور اس کو عام انسانوں کے لیے ممنوعہ علاقہ قرار دے دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے قریب بعض چراگاہوں کو حمیٰ قرار دے دیا جہاں صدقے کے اونٹ رکھے جاتے تھے۔ ان میں ایک چراگاہ وہ تھی جہاں بنی عرینہ کے بعض لوگ بھیجے گئے تھے جنہوں نے حضور کے کارندے کو شہید کر دیا تھا۔

بازار کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بازار میں اوزان اور پیمانے متعین ہوں۔ اگر ہر شخص الگ الگ اپنے اوزان اور پیمانے رکھے گا تو بازار میں سنٹرلائزیشن اور معیار بندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانیٹری اکانومی کی حوصلہ افزائی کرکے بازار اور تجارت میں اسٹینڈر ڈائزیشن کو بہتر اور مقبول قرار دیا۔ معیار بندی کا ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ پیمانوں اور اوزان کو متعین کیا جائے۔ اس زمانے میں یہ بھی تھا کہ مختلف علاقوں میں مختلف پیمانے اور اوزان مقرر تھے۔ مکہ مکرمہ کا پیمانہ اور تھا مدینہ منورہ کا پیمانہ اور تھا۔ اب مکہ کے لوگ چونکہ تجارت میں نمایاں تھے۔ دور دراز کی تجارت میں نقد رقم لے کر جایا کرتے تھے۔ سونا اور چاندی کی صورت میں ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں ہوتی تھیں، اس لیے سونے اور چاندی کی پرکھ کا معیار مکہ میں زیادہ اسٹینڈ رائزڈ تھا اور مدینہ میں زراعت زیادہ تھی اس لیے چیزوں کو ناپنے کے پیمانے مدینہ میں زیادہ اسٹینڈ رائزڈ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ: اَلْمِكْيَالُ مِكْيَالُ اَهْلِ الْمَدِيْنَه

ناپنے کے پیمانے مدینہ کے معیاری مانے جائیں گے اور وَالْوَزْنُ وَزْنُ اَهْلِ مَكَّة، اور سونے چاندی کو تولنے یا گننے کے پیمانے اہل مکہ کے معیاری مانے جائیں گے۔ یعنی سکوں اور

سونے چاندی کا معیار مکہ کے معیار کے مطابق ہو گا، اس لیے کہ وہ تجارت کا مرکز ہے۔ زرعی پیمانے مدینہ کے ہوں گے، کیونکہ وہاں زرعی کاروبار زیادہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار میں نگران اور انسپکٹروں کے علاوہ بہت سے اور افراد بھی مقرر فرمائے ایک صاحب الاعشار ہوتا تھا، یہ تاجروں کے سرمائے کا اندازہ کرکے ان سے عشر لیا کرتا تھا۔ ایک صاحب الخراج مقرر فرمایا۔ یہ زمین کی پیداوار سے حصہ وصول کرتا تھا۔ ایک صاحب الجزیہ مقرر فرمایا۔ یہ غیر مسلموں سے ٹیکس لیا کرتا تھا۔ ایک صاحب المساحہ مقرر فرمایا تھا جو زمین کی جانچ اور پیداوار کا اندازہ، یعنی assessment کرتا تھا۔ کئی صوبوں میں الگ الگ عامل زکوٰۃ مقرر فرمائے۔ کاتب صدقات الگ مقرر فرمائے۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی زمینوں اور زرعی پیداوار کا تخمینہ اور assessment کرنے کے لیے خیبر بھیجے گئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل سے معاہدات فرمائے تھے۔ حرمت سود کے بعد سے جتنے معاہدات فرمائے ان میں یہ بھی فرمایا کہ تم سودی کاروبار نہیں کروگے۔ اور بعض غیر مسلم قبائل سے کئے جانے والے معاہدہ میں یہ بھی لکھا کہ تم میں سے جو سودی کاروبار کرے گا تو اس کے ساتھ معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔ چنانچہ نجران کے عیسائیوں سے جب معاہدہ کیا گیا اس میں ان کو بہت سی مراعات اور حقوق دیئے گئے۔ آج مذہبی آزادی کے جتنے حقوق کی بات ہوتی ہے اس معاہدوں میں ان تمام حقوق کا تذکرہ ہے، لیکن اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ: وَمَنْ اَرْبٰوا مِنکُمْ فَذِمَّةُ اللهِ بَرِيئَةٌ

تم میں سے جو کوئی ربٰو کا کاروبار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہے۔ یعنی یہ معاہدہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اطلاع ملی کہ نجران کے عیسائی ربا کا کاروبار کر رہے ہیں اور سود میں ملوث ہیں۔ یہ اطلاع صحیح ثابت ہونے پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس معاہدہ کو منسوخ کر دیا اور انہیں جلاوطن کرکے شام بھیج دیا۔

ریاست مدینہ میں اقلیت

مدینہ منورہ میں جو غیر مسلم رہتے تھے ان سے بھی ریاست کے امور میں کام لیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایسی ذمہ داریاں جو ریاست کے strategic interests سے متعلق ہیں، یا شریعت کی فہم اور تعبیر سے متعلق ہیں وہاں غیر مسلم کو مقرر نہیں کیا جاتا تھا، لیکن جو فنی مہارت کے معاملات ہیں وہاں غیر مسلموں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو اہم ترین مواقع پر غیر مسلموں سے کام لیا۔ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہے تھے اور ہر عرب قبیلہ سو اونٹوں کے لالچ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راستہ بتانے کے لیے جو آدمی رکھا گیا وہ عبد اللہ بن اریقط ایک غیر مسلم تھا۔ اس غیر مسلم پر حضور نے اعتماد کیا اور وہ نہایت قابل اعتماد آدمی ثابت ہوا۔ اگر وہ سو اونٹوں کی لالچ میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرانا چاہتا تو اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب دیکھئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس آدمی کو چنا اس نے ایک دوسرے راستے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔

حضرت عمرو بن امیہ الضمری کا میں نے ذکر کیا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کے سفیر رہے۔ جب وہ بطور سفیر پہلی مرتبہ بھیجے گئے تو اس وقت وہ مسلمان نہیں تھے۔ یہ بات ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی فرانسیسی سیرت کی جلد اول میں لکھی ہے۔

اسی طرح سے کئی اور غیر مسلم حضرات سے کام لیا گیا۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ غیر مسلموں سے ایسی اطلاع مل جاتی تھی جس کی اطلاع دینا ان کی نیت میں نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے موقع پر تشریف فرما تھے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ اب تجارتی قافلہ

سے نہیں، بلکہ قریش کے لشکر سے ہی مقابلہ ہو گا۔ ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ لشکر میں کتنے آدمی ہیں۔ حضور نے دو صحابہ کرامؓ کو اس غرض کے لیے بھیجے کہ دشمن کی تعداد کا پتہ لگائیں۔ وہ کوشش کے باوجود صحیح تعداد معلوم نہیں کر سکے۔ ایک لڑکا جو بکریاں چرا رہا تھا، اس کو مشکوک سمجھ کر صحابہ کرام اپنے ساتھ لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ صحابہ نے لڑکے سے قریش کی فوج اور قافلہ کے بارے میں پوچھا، لیکن اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ صحابہ کرامؓ کا خیال تھا کہ یہ لڑکا تجارتی قافلہ میں شریک ہے اور اس کے بارے میں معلومات کو چھپا رہا ہے۔ لڑکا کہنے لگا کہ میں نے قافلہ نہیں دیکھا، البتہ قریش کا لشکر دیکھا ہے۔ صحابہ نے اس پر کچھ سختی کی تو اس نے تسلیم کیا کہ ہاں میں نے قافلہ کو دیکھا ہے۔ اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب وہ سچ بول رہا تھا تو تم اس کو مار رہے تھے جب اس نے جھوٹ بول دیا تو تم نے چھوڑ دیا۔ اس نے قافلہ کو نہیں، بلکہ لشکر ہی کو دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکے سے پوچھا کہ تم نے قریش کے لشکر کو دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں میں ان کو دودھ فراہم کرنے گیا تھا۔ پوچھا کہ لشکر میں کتنے آدمی تھے، تو اس نے کہا کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ صحابہ کرامؓ نے پھر کہا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا تم نے ان کو کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ بتاؤ کہ کتنے اونٹ ذبح کر کے کھاتے ہیں۔ اس نے دیکھا تھا تو کہا کہ ایک دن میں نے دیکھا نو اونٹ ذبح ہوئے تھے اور ایک اور دن دیکھا کہ دس اونٹ ذبح ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہیں اور واقعی وہ ساڑھے نو سو تھے۔ ان کی تعداد بعینہٖ نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہی نکلی کیونکہ اونٹوں کی اتنی تعداد اتنے لوگوں کے لیے کافی ہوتی ہے۔

یہ شعبہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معلومات اور سراغ رسانی کا قائم فرمایا اس میں تین ذیلی شعبے تھے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے لَا تَجَسَّسُوا، ایک دوسرے کا تجسّس نہ

کرو۔ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اس میں تو جاسوسی سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا جاسوسی کا شعبہ کیسے اسلامی ہو سکتا ہے۔ آج اسی طرح انٹیلی جنس کے لوگ بھی تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن میں یہ حکم لَا تَجَسَّسُوا جاسوسی مت کرو اور ہمارا تو کام ہی تجسّس ہے۔

عربی زبان میں تین الفاظ ہیں: (۱) **تجسس** (۲) **تحسس** اور (۳) **تعسس**۔

تحسس کا مطلب ہے کسی مقصد یا ہدف کی خاطر مثبت چیز کا پتہ لگانا۔

یَا بَنِیَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِن يُّوسُفَ

"اے بیٹو جاؤ اور یوسف کے بارے میں پتہ چلاؤ۔"

ایک **تعسس** ہوتا ہے جو کسی جرم کو روکنے کی خاطر اور کسی برائی کو وجود میں آنے سے پہلے پیش بندی کے لیے کیا جاتا ہے۔ تجسّس وہ ہے کہ کسی کے خلاف کوئی برائی سوچی ہو اور اس برائی کے لیے تجسّس کی جائے۔ یہ **تجسس** ہے جس کی ممانعت ہے۔ **تعسس** اور **تحسس** کی ممانعت نہیں ہے۔ وہ سنت اور سیرت سے ثابت ہے۔

غیر مسلموں کی آبادیاں مدینہ کے باہر بھی تھیں۔ جو قبائل اسلام میں داخل نہیں ہوئے ان کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے بعض مراعات عطا فرمائیں۔ بعض قبیلوں کو حضور نے لکھ کر دیا کہ: مَن كَانَ عَلَىٰ يَهُودِيَّتِهِ أَوْ عَلَىٰ نَصْرَانِيَّتِهِ فَإِنَّهُ لَا يُبْلَىٰ عَنْهَا

جو شخص اپنی یہودیت یا نصرانیت پر قائم ہے اس کو کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا جائے گا اور اس پر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے نجران کے عیسائیوں کو ایک چارٹر عطا کیا تھا۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ ان کو تمام حقوق اور مراعات دیئے جائیں گے۔ ان کے پادریوں اور گرجوں کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ وہ اپنے عہدوں پر قائم رہیں گے، لیکن وہ اسلامی شریعت کی بالادستی قبول کریں گے۔ مسلمانوں کو ٹیکس دیں گے اور اگر سود کا کاروبار کیا تو یہ معاہدہ ختم کر دیا جائے گا۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ سود کا کاروبار کرو گے تو تمہاری شہریت منسوخ کر دی جائے گی۔ چنانچہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ نجران کے عیسائی ربٰو کا کاروبار کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ تم لوگوں نے

معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس لیے یہ معاہدہ منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کو جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا۔

حضور علیہ السلام کے زمانے میں جو علاقائی نظم و نسق قائم ہوا اس ضمن میں ایک بات یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل سے جو معاہدے کئے تو ان قبائلی سرداروں کو آپ نے اپنے نمائندے کے طور پر تسلیم کر لیا۔ بہت کم صورتیں ایسی ہوں گی کہ کسی نئے آدمی کو مقرر کیا گیا ہو۔ اکثر صورتوں میں اسی آدمی کو مقرر کیا گیا۔ بعض صورتوں میں حضور نے دو چیزوں کی یقین دہانی بھی کرائی۔

اِنَّہٗ لَا یُؤمَّرُ عَلَیکُم مَن لَّیسَ مِنکُم

جو شخص تمہارے قبیلے سے نہیں ہے اس کو تم پر امیر مقرر نہیں کیا جائے گا۔ یہ یقین دہانی کرائی کہ تمہارے حکمران تمہارے ہی لوگ ہوں گے۔ یہ باہر سے حکمرانوں کا مقرر کیا جانا غلطیوں اور غلط فہمیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔

دوسری یہ یقین دہانی فرمائی کہ تمہارے جو اپنے وسائل جنگلات اور پانی وغیرہ کی صورت میں ہیں وہ تمہارے ہی کنٹرول میں رہیں گے اور کوئی ان کو تمہاری رضامندی کے بغیر استعمال نہیں کر سکے گا۔ یہ بھی غلط فہمی کا ذریعہ بنتا ہے کہ ہمارے وسائل دوسروں کے قبضہ میں چلے جائیں۔ کسی علاقہ کے لوگوں کو یہ بدگمانی یا خیال ہو جائے کہ ہماری دولت فلاں کھا گیا یا فلاں کھا گیا تو اس سے ریاست کی بقا اور وحدت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ بہت درپیش رہتا ہے۔ اگر پہلے دن سے ہی یہ دو باتیں طے ہوتیں کہ تمہارے صوبے پر تمہارے ہی آدمی کو مقرر کیا جائے گا۔ تمہارے وسائل تمہارے ہی کنٹرول میں رہیں گے اور تمہاری ہی اجازت سے استعمال ہوں گے تو شاید پاکستان نہ ٹوٹتا۔ اور نہ آج صوبائی خود مختاری اور غیر خود مختاری کا مسئلہ ہوتا۔